الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اصول کی بنیاد پر چپ ہونا بہادری ہے
اور مصلحت کی بنیاد پر چپ ہونا بزدلی

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435
اپریل ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۵

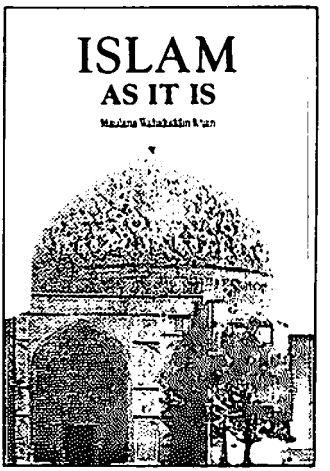

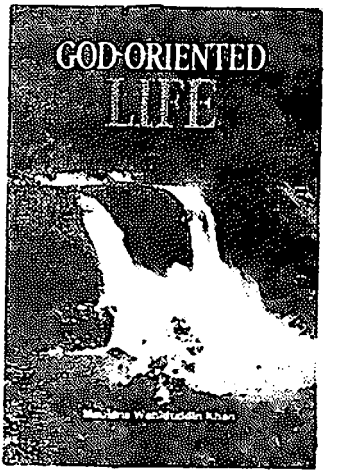

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۵

ایمان کا ذائقہ	۴	حمد الٰہی	۱۶
جنت کی یافتیں	۵	خاموشی	۱۷
کون کنٹرول کرے	۶	علم کا حصول	۱۸
شرمندگی اور اعتراف	۷	مستقبل پر نظر	۱۹
کامیابی کیسے	۸	رضوان اللہ، رضوان العباد	۲۰
زمانہ تیاری	۹	بیرونیات، اندرونیات	۲۱
حکیمانہ طریقہ	۱۰	دو بول	۲۲
کامیابی کا پاسپورٹ	۱۱	زوال کی علامت	۲۳
تعمیر شور	۱۲	ایک تبصرہ	۲۴
پہلا جھٹکا	۱۳	قومی یک جہتی کا مسئلہ	۲۷
ناکامی، کامیابی	۱۴	دعوت الی اللہ	۳۲
شکر گزاری	۱۵	سفرنامہ امریکہ — ۵	۳۴

AL-RISALA (URDU) Monthly
The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013
Telephone: 611128, 697333; Fax: 91-11-3312601 (Attn: Tel. 697333)
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US$25 (Air Mail)

ایمان کا ذائقہ

امام مسلم بن الحجاج (۲۶۱ - ۲۰۶ ھ) بلند پایہ محدث ہیں۔ الجامع الصحیح یا الصحیح لمسلم ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے "کتاب الایمان" میں ایک باب ان الفاظ کے تحت قائم کیا گیا ہے: باب الدلیل علی ان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا فھو مومن و ان ارتکب المعاصی للکبائر۔ اس باب کے ذیل میں انھوں نے یہ حدیث نقل کی ہے:

عن العباس بن عبد المطلب انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا۔

عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ایمان کا مزا چکھا اس شخص نے جو راضی ہوگیا اللہ کو رب بنانے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد کے رسول ہونے پر۔

انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ انا (ego) کا جذبہ ہے۔ آدمی ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے مگر وہ انا کی قربانی دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں ہیومنزم کی صورت میں اس نے آخری فتنہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ہیومنزم کا مطلب ہے ——— تقدیر کی نشست کا خدا کے بجائے انسان کی طرف منتقل ہوجانا۔

Transfer of seat from God to man.

ایمان دراصل اسی انا کی قربانی کا نام ہے۔ مومن اپنی انا کو دفن کرکے خارجی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے راضی ہوتا ہے کہ اس کے اپنے لیے عبد کی سیٹ ہو اور خدا کے لیے معبود کی سیٹ۔ وہ خدا کے پیغمبر کو پیغمبر کا مقام دے اور خود اپنے لیے غیر پیغمبر کے مقام کو پسند کرلے۔ وہ صرف خدا کے دین کو دین کا درجہ دے اور خود دین وضع کرنے کے حق سے مکمل طور پر دست بردار ہوجائے۔

اس قسم کا ایک فیصلہ زبردست فکری انقلاب کے بعد ممکن ہوتا ہے۔ ایسا آدمی معرفت کا خصوصی ذائقہ چکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اس خصوصی قربانی کے لیے کبھی آمادہ نہ ہوسکے۔

جنت کی یافتیں

امریکہ کے سفر (دسمبر ۱۹۹۰) میں ایک صاحب سے آخرت اور جنت کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جنت کا تصور یہ دیا گیا ہے کہ وہاں ہر طرف آرام ہی آرام ہوگا۔ ایسی جنت آدمی کے لیے خوشیوں کی جگہ نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ زندگی نام ہے چیلنج میں جینے کا۔ چیلنج کا مقابلہ کر کے آدمی کی روح کو ایک اہتزاز حاصل ہوتا ہے۔ آدمی ایک ایسی دنیا میں خوش نہیں رہ سکتا جہاں چیلنج کو ختم کر دیا گیا ہو۔

میں نے کہا کہ جو چیز انسان کو اہتزاز بخشتی ہے وہ چیلنج نہیں بلکہ چیلنج کا نتیجہ ہے۔ یہ نتیجہ دریافت ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو چیلنج پیش آتے ہیں۔ آدمی اس چیلنج کا سامنا کر کے ایک نئی یافت (finding) تک پہونچتا ہے۔ یہ نئی یافت اس کو بے پناہ خوشی دیتی ہے۔ گویا اصل چیز یافت ہے۔ چیلنج تو اس کا محض ایک فارم ہے۔ اور فارم یقیناً ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

جنت میں یافتوں کا سلسلہ موجودہ دنیا سے بے حساب گنا زیادہ بڑھ جائے گا۔ مگر یہ یافتیں چیلنج اور جوکھم کے ذریعہ نہیں ہوں گی بلکہ شغل فاکہہ (لیسن ۵۵) کے ذریعہ ہوں گی۔ آدمی ہر دن نئی لذت، نئی معنویت اور نئے حقائق دریافت کرے گا۔ یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا، اس لیے اس کی خوشیوں کا سلسلہ بھی ابد تک باقی رہے گا۔ وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

چیلنج میں آدمی کو لذت اس لیے ملتی ہے کہ چیلنج کی صورت حال آدمی کو مشغولیت دیتی ہے۔ اس میں آدمی اپنی ذات کو بھرپور طور پر استعمال ہوتا ہوا پاتا ہے۔ اپنی ذات کو مشغول کرنا اور پھر اپنی کوششوں سے ایک چیز کو پالینا، چیلنج کی یہی صفت آدمی کے لیے چیلنج کو لذیذ بناتی ہے۔ یہ چیز آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہے گی۔

کسی چیز کا نیا ہونا اس کو آدمی کے لیے مرغوب بناتا ہے۔ یہ نیا پن دنیا میں محدود طور پر حاصل ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ دنیا میں ہر یافت کے ساتھ ایک رسک لگا ہوا ہے۔ یہ محدودیت اور یہ رسک موجودہ دنیا کی خوشیوں کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ آخرت میں نیا پن مزید اضافہ کے ساتھ باقی رہے گا۔ مگر محدودیت اور رسک کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آخرت کی دنیا میں لذت ہی لذت ہوگی اور خوشی ہی خوشی۔

اپریل ۱۹۹۲

کون کنٹرول کرے

سر جولین ہکسلے کی ۲۰۰ صفحہ کی ایک کتاب ہے جس کا نام "مذہب بغیر الہام" ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب (بمعنی انسانی طریقہ) الہام خداوندی کی بنیاد پر قائم کرنے کا دور ختم ہو گیا۔ اب انسان خود اپنا مذہب بنا رہا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد عقل (ریزن) پر ہے۔ اور اس کا نام ہیومنزم ہے۔

مصنف کے نقطۂ نظر کا خلاصہ اس کے ان الفاظ میں ہے کہ ——— موجودہ زمانہ میں انسان نے بڑی حد تک خارجی فطرت کی طاقتوں کو جاننے، ان کو کنٹرول کرنے اور ان کو استعمال کرنے کی بابت سیکھ لیا ہے۔ اب اس کو خود اپنی فطرت کی طاقتوں کو جاننے اور ان کو کنٹرول کرنے اور ان کو استعمال کرنے کی بابت سیکھنا ہے :

Man has learnt in large measure to understand, control and utilize the forces of external nature: he must now learn to understand, control and utilize the forces of his own nature (p. 170).

Sir Julian Sorell Huxley (1887-1975)
Religion Without Revelation,
Pitman Publishing Limited, London, 1979

یہی موجودہ زمانہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ملحدین کا عام نظریہ ہے۔ مگر یہ لفظی تک بندی کے سوا اور کچھ نہیں حقیقت یہ ہے کہ خارجی مادہ کو کنٹرول کرنا جتنا ممکن تھا، اتنا ہی یہ ناممکن ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کو کنٹرول کرے۔ مادہ خود اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسان بھی خود اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ انسان کے لیے مادہ کو کنٹرول کرنا اس لیے ممکن ہوا کہ انسان کو اپنے دماغ کی بنا پر مادہ کے اوپر بالاتری حاصل تھی۔ اسی طرح انسان کو وہ ہستی کنٹرول کر سکتی ہے جس کو انسان کے اوپر بالاتری حاصل ہو۔ کوئی برابر اپنے برابر کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔

انسان کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک برتر خدا کا عقیدہ درکار ہے۔ برتر خدائی عقیدہ کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کو قابو میں رکھ سکے۔

شرمندگی اور اعتراف

جان ڈرائیڈن (John Dryden) مشہور انگریز ادیب ہے۔ وہ ۱۶۳۱ میں پیدا ہوا، اور ۱۷۰۰ میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول یہ ہے کہ ——— پشیمانی کمزور ذہنوں کی نیکی ہے :

Repentance is the virtue of weak minds.

مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ یہ کہ پشیمان نہ ہونا آدمی کے کمزور دماغ اور پست حوصلہ ہونے کی علامت ہے۔

اس دنیا میں سب سے بڑی نیکی اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ اگر آدمی کی فطرت زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوگا کہ کوتاہی کا کوئی واقعہ ہوتے ہی اس کی روح تڑپ اٹھے گی۔ اس کو شدت کے ساتھ ندامت اور پشیمانی کا احساس ہوگا۔ یہ اس کے دل پر اتنا بڑا بوجھ بن جائے گا کہ اس کو اس وقت تک چین نہیں ملے گا جب تک وہ یہ نہ کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔

آدمی اپنی غلطی کا اعتراف کیوں نہیں کرتا۔ اس کو اپنے کیے پر پشیمانی کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ایسا کر کے میں دوسروں کی نظر میں اور اپنی نظر میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔ مگر اس قسم کا ہر اندیشہ صرف حوصلہ کی کمی کا ثبوت ہے۔ اگر آدمی اپنے اندر اعلیٰ حوصلہ رکھتا ہے تو وہ ایسے مواقع پر پشیمانی اور اعتراف سے کبھی رُک نہیں سکتا۔

غلطی کیا ہے۔ غلطی یہ ہے کہ آدمی مسلّمہ انسانی اصولوں کی خلاف ورزی کرے۔ وہ اعلیٰ معیار صداقت پر پورا نہ اترے۔ ایسی حالت میں جب ایک شخص غلطی کر کے اس پر شرمندہ نہ ہو۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ذاتی بڑائی کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی ذات کو حقیقت سے زیادہ بلند سمجھتا ہے۔ حقیقت کا مجروح ہونا اسے گوارا ہے مگر خود اپنی ذات کا مجروح ہونا اس کو گوارا نہیں۔

غلطی ماننا غلطی کی اصلاح ہے۔ اور غلطی نہ ماننا غلطی کو باقی رکھنا ہے۔ اب آدمی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان میں سے کون سا رویہ اس کے لیے زیادہ درست ہے۔

کامیابی کیسے

فروری ۱۹۹۲ میں دہلی میں بڑے پیمانہ پر کتابوں کی نمائش (بک فیر) لگائی گئی۔ ۷ فروری کو میں بھی اس کو دیکھنے کے لیے گیا۔ مختلف اسٹال دیکھتے ہوئے ایک جگہ پہنچا تو اس کے بورڈ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ بورڈ کے الفاظ تھے : تھنک انکارپوریٹڈ (Think Incorporated)

یہ اس بک فیر میں ایک انوکھا اسٹال تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو سوچنے کا آرٹ بتایا جائے۔ کیوں کہ غلط سوچ آدمی کو ناکامی کی طرف لے جاتی ہے اور صحیح سوچ کامیابی کی طرف۔

یہاں مسٹر پرمود کمار بترا کی ایک خوب صورت چھپی ہوئی انگریزی کتاب تھی۔ اس کا نام مینجمنٹ تھاٹس (Management Thoughts) تھا۔ اس کے ۲۱۵ صفحات ہیں۔ اور اس میں ۱۳۶۰ مفید اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قول یہ تھا کہ ہمارا ذہنی رویہ ہماری بلندی کا تعین کرتا ہے :

Our attitude determines our altitude.

اسی طرح اس اسٹال پر کئی تصویری کتبے تھے۔ ایک کتبہ میں اوپر ماچس کی ایک تیلی دکھائی گئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ ماچس کی تیلی کا ایک سر ہوتا ہے مگر اس میں دماغ نہیں ہوتا۔ اس لیے جب بھی کوئی رگڑ ہوتی ہے وہ فوراً جل اٹھتی ہے۔ آیئے ہم ماچس کی ایک چھوٹی تیلی سے سبق لیں۔ ہم اور آپ سر رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ دماغ بھی۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اشتعال پر بھڑک نہ اٹھیں :

A match-stick has a head, but it does not have a brain.
Therefore, whenever there is a friction, it flares up immediately.
Let us learn from this humble match-stick.
You and we have heads as well as brains.
Therefore, let us not react on impulse.

ایک انسان وہ ہے جو بھڑکنے والی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ فوری جذبہ کے تحت عمل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ ناکام رہے گا۔ دوسرا انسان وہ ہے جو بھڑکانے والی بات ہو تب بھی نہیں بھڑکتا۔ وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا ہے، پھر اپنا عمل کرتا ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ دوسرا انسان انسان ہے اور پہلا صرف ماچس کی ایک تیلی۔

زمانۂ تیاری

بچوں کی ابتدائی عمر کے زمانہ کو زمانۂ تیاری (formative period) کہا جاتا ہے۔ اس ابتدائی زمانہ میں اگر کوئی کمی رہ جائے تو وہ ساری عمر باقی رہتی ہے، اس کے بعد اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

ایک صاحب کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کو دیکھ کر بتایا کہ اس کی ہڈیاں کمزور ہیں۔ اس کو ایک عرصہ تک برابر کیلشیم اور مچھلی کا تیل کھلایا جائے۔ ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے کمزور رہ جائے گی۔ باپ نے ڈاکٹر کے مشورہ کا خیال نہیں کیا اور اس کو مذکورہ چیزیں نہیں کھلائیں۔

لڑکی جب بڑی ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ جسمانی کمزوری کی شکار ہے۔ محنت کا کام کرتے ہی وہ بیمار پڑ جاتی۔ شادی کے بعد آپریشن کے ذریعہ اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کے بعد اس کی کمزوری اور مرض میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ ساری عمر اسی طرح مصیبت میں مبتلا رہی، یہاں تک کہ مایوسانہ زندگی گزارتے ہوئے مر گئی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا بھی ہے۔ موجودہ دنیا تیاری کا زمانہ ہے اور آخرت کی دنیا زندگی بسر کرنے کا زمانہ۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو جو مختصر عمر ملتی ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی زندگی کی حقیقت کو سمجھے۔ وہ صحیح اصولوں کے مطابق اپنے صبح و شام گزارے۔ وہ اپنے خالق کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرے اور انسانوں کے جو حقوق ہیں ان کو ادا کرے۔ وہ سرکشی اور گھمنڈ سے اپنے آپ کو بچائے اور تواضع اور انصاف اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت زندگی گزارے۔

موجودہ دنیا آخرت کے اعتبار سے زمانۂ تیاری ہے۔ جو لوگ آج تیاری کریں گے، وہ کل کے دن صحت و سلامتی کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل ہوں گے۔ اور جو لوگ آج کے مواقع کو تیاری میں نہیں لگائیں گے وہ آئندہ آنے والی زندگی میں بیماریوں اور مصیبتوں کا شکار رہیں گے۔ صحت و سلامتی کی زندگی سے وہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں گے۔

حال میں تیاری کرنے والا مستقبل میں اپنی تیاری کے نتائج کو پاتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں تیاری کرنے والا آخرت میں اپنی تیاری کے نتائج کو بھرپور طور پر پائے گا۔

حکیمانہ طریقہ

زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو یہ فیصلہ لینا پڑتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایسے مواقع پر فیصلہ لینے کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک یہ کہ کیا درست ہے، دوسرے یہ کہ کیا ممکن ہے :

1. What is right.
2. What is possible

حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں آدمی یہ دیکھے کہ کیا درست ہے۔ اور جو طریقہ درست ہو اس کو اختیار کرلے۔ مگر اجتماعی معاملہ کے لیے صحیح بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ممکن کیا ہے، اور جو چیز ممکن ہو اس کو اپنا لیا جائے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں سارا مسئلہ صرف اپنی ذات کا ہوتا ہے۔ آپ کو اپنی ذات پر پورا اختیار ہے۔ اپنی ذات کو آپ جس طرف چاہیں موڑیں اور اپنے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ اس لیے آپ کو اپنی ذات کے معاملہ میں معیار پسند ہونا چاہیے اور حتی الامکان وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو مذہب اور اخلاق کی رو سے مطلوب ہے۔

مگر اجتماعی معاملہ میں آپ کی ذات کے ساتھ ایک اور فریق شامل ہو جاتا ہے۔ اس خارجی فریق پر آپ کو کوئی اختیار نہیں۔ آپ اس سے کہہ سکتے ہیں، مگر اس کو کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں عقل مندی کی بات یہ ہے کہ اجتماعی معاملہ میں "ممکن" کو دیکھا جائے۔ دو صورتوں میں سے جو صورت عملاً ممکن ہو اس پر اپنے آپ کو راضی کر لیا جائے۔

ذاتی معاملہ میں "درست" پر چلنے سے زندگی کا سفر رکتا نہیں، وہ برابر جاری رہتا ہے۔ مگر اجتماعی معاملہ میں ایسا کیا جائے تو فریق ثانی کی مخالفت فوراً آپ کے سفر کو روک دیتی ہے۔ اب سفر کو ملتوی کر کے ساری طاقت نزاع کے محاذ پر خرچ ہونے لگتی ہے۔ اس لیے مفید اور نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کے مطالبہ کی رعایت کرتے ہوئے عمل کی جو ممکن صورت مل رہی ہے، اس کو اختیار کر لیا جائے۔ حال کو مستقبل کے حوالہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا جائے۔

یہی اس دنیا میں زندگی گزارنے کا حکیمانہ طریقہ ہے۔

کامیابی کا پاسپورٹ

امریکہ موجودہ زمانہ میں لوگوں کے لیے معاشی جنت بنا ہوا ہے۔ جو لوگ امریکی پالیسیوں کے سخت مخالف ہیں وہ بھی پہلا موقع پاتے ہی امریکہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہاں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کر سکیں۔

اس سلسلہ میں ایک رپورٹ نظر سے گزری۔ جس کا عنوان تھا (Asian success story) اس کے مطابق، امریکہ میں جو ایشیائی امریکی (Asian Americans) آباد ہیں، ان کی اوسط آمدنی دوسرے امریکیوں کی اوسط آمدنی سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جب غریب ملکوں سے نکل کر امریکہ پہنچتے ہیں اور وہاں دولت کی فراوانی دیکھتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ رات دن محنت کر کے چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ دولت اپنے لیے سمیٹ لیں۔

یہ لوگ چین، فلپائن، کوریا، انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، ویٹ نام وغیرہ سے نکل کر امریکہ پہنچتے ہیں۔ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ سالانہ پچاس ہزار ڈالر یا اس سے زیادہ کمانے والوں میں ان مہاجرین کا اوسط ۳۲ فی صد ہے، جب کہ دوسرے سفید فام امریکیوں کا اوسط صرف ۲۹ فی صد۔ ان سنہری مواقع کی بنا پر ایشیائی باشندے کثرت سے امریکہ کے شہروں میں پہنچ رہے ہیں۔

رپورٹر نے اس سلسلہ کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے آخر میں لکھا تھا کہ ایشیائی مہاجرین کی کامیابی کی کہانی "تیسری دنیا" کے لوگوں کی امید میں اضافہ کر رہی ہے جن کا یقین ہے کہ امریکہ کا گرین کارڈ کامیابی کا پاسپورٹ ہے :

The Asian immigrant success story raises the hopes of thousands of Indians who believe that the passport to success is a US green card (p.8).

امریکہ کے سفر میں بعض "کامیاب" ہندستانیوں سے میں نے آخرت کے بارہ میں بات کی۔ میں نے کہا کہ "مذہب آخرت کی کامیابی کا پاسپورٹ ہے"۔ انھوں نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی کو پانے کے لیے دنیا کی کامیابی کو کھونا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ اصل چیز کامیابی سمجھنے کو کھونا ہے نہ کہ خود کامیابی کو کھونا۔ مذہب کی روح یہ ہے کہ دنیا کو ترقی کا مقام سمجھنے کے بجائے امتحان کا مقام سمجھا جائے۔

تعمیرِ شعور

دوسری جنگ عظیم تک امریکہ ساری دنیا میں موٹر کار کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ ہر آدمی کے ذہن پر رولس رائس کار کی عظمت چھائی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی ووکس ویگن کا زمانہ آیا۔ ۱۹۷۰ تک ۱۴۰ ملکوں میں ۱۶ ملین سے زیادہ ووکس ویگن گاڑیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ مگر اب جاپانی کاروں کا زمانہ ہے۔ آج ٹویوٹا (نہ کہ جنرل موٹرس) کاروں کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ امریکہ کی سڑکوں پر آج جو کاریں دوڑتی ہیں ان میں ۲۵ فی صد کاریں جاپان کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

آج دنیا بھر میں استعمال ہونے والا الکٹرانک سامان ۸۰ فی صد جاپان کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ امریکہ کا اپالو دوم جب چاند پر گیا تو اس کے اندر رکھنے کے لیے ایک بہت چھوٹے ٹیپ ریکارڈر (کیسٹ ریکارڈر) کی ضرورت تھی۔ اتنا چھوٹا اور بالکل صحیح کام کرنے والا ریکارڈر صرف جاپان فراہم کر سکتا تھا۔ چنانچہ اپالو دوم کے ساتھ جاپانی ساخت کا ریکارڈر رکھ کر اسے چاند پر روانہ کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم تک جاپان کا یہ حال تھا کہ (Made in Japan) کا لفظ جس سامان پر لکھا ہوا ہو اس کے متعلق پیشگی طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ سستا اور ناقابل اعتماد ہوگا۔ جاپانی سامان کی تصویر اتنی گھٹیا تھی کہ مغربی ملکوں کے تاجر جاپانی ساخت کا سامان اپنی دکان پر رکھنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ پھر صرف ۴۰ سال کے اندر جاپان نے کس طرح ایسی انقلابی ترقی حاصل کر لی۔ ایک امریکی عالم ولیم اوچی (William O'uchi) کے الفاظ میں اس کا راز اپنے کارکنوں کے اندر داعیہ پیدا کرنا (Motivation of the employees) ہے۔

جاپانیوں نے اپنے یہاں ابتدائی تعلیم کا انتہائی اعلیٰ معیار قائم کیا۔ انھوں نے ابتدائی معلموں کو اعلیٰ تنخواہ اور پروفیسروں والا اعزاز دینا شروع کیا اور اس طرح اعلیٰ ترین صلاحیت کے اساتذہ کو اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر لگا دیا۔ انھوں نے اپنے افراد میں نہایت گہرائی کے ساتھ یہ شعور پیدا کیا کہ صنعت میں اصل چیز معیار (Quality) ہے۔ جدید جاپان میں ہر جگہ کوالٹی کنٹرول سرکل قائم ہیں۔ ۱۹۸۰ تک ایک لاکھ کوالٹی کنٹرول رجسٹرڈ سرکل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ ایک ملین غیر رجسٹرڈ کوالٹی سرکل بھی جاپان میں موجود ہیں۔

پہلا جھٹکا

امام ابوداؤد نے ادب کے تحت یہ حدیث (رقم ۴۷۸۴) نقل کی ہے کہ عبداللہ ابن بحیر الصنعانی کہتے ہیں کہ ہم عروہ بن محمد السعدی کے پاس گیے۔ اس وقت ایک شخص نے ان سے بات کی اور ان کو غضب ناک کر دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھے اور وضو کیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ میرے باپ نے میرے دادا عطیہ سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے۔ اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ پس تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وہ وضو کرلے (فاذا غضب احدکم فلیتوضأ)

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ آدمی کو جب غصہ آئے تو وہ اگر کھڑا ہے تو وہ بیٹھ جائے۔ اور اگر وہ بیٹھا ہے تو وہ لیٹ جائے۔ وہ اپنی زبان سے کہے کہ اے اللہ، میں شیطانِ رجیم سے تیری پناہ چاہتا ہوں (اللّٰھم انی اعوذ بک من الشیطٰن الرجیم)

جب کوئی شخص آپ کو برا کہے یا آپ کے خلاف زیادتی کا کوئی کلمہ کہہ دے تو فوری طور پر آپ کے دل کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ آپ کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس وقت اگر پہلے جھٹکے کو برداشت کر لیا جائے تو ایک لمحہ کے بعد اندر کی آگ بجھ جائے گی۔ اور آپ ایک نارمل انسان کی مانند ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر پہلے جھٹکے کو برداشت نہ کرتے ہوئے ردِ عمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ردِ عمل اور جوابی ردِ عمل کی صورت میں سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ غصہ ٹکراؤ تک پہونچ جاتا ہے اور ٹکراؤ ہلاکت اور تباہی تک۔

حدیث میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ گویا معاملہ کو پہلے جھٹکے پر ختم کرنے کی کچھ علامتی تدبیریں ہیں۔ حالات کے لحاظ سے اس قسم کی کوئی بھی تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ مثلاً غصہ کے وقت اپنے مقام سے ہٹ جانا۔ کمرہ سے نکل کر کھلی فضا میں ٹہلنے لگنا، ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لے کر پی لینا، وغیرہ۔ کسی بھی طرح اگر آپ نے پہلے جھٹکے کو سہہ لیا تو اس کے جلد ہی بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے سینہ میں غصہ کا ہیجان ختم ہو چکا ہے۔ آپ ایک معتدل انسان بن چکے ہیں جس طرح آپ غصہ سے پہلے ایک معتدل انسان تھے۔

ناکامی، کامیابی

امریکہ کی ترقی کا راز ایک سادہ سے لفظ میں چھپا ہوا ہے، وہ لفظ ریسرچ (تحقیق) ہے۔ وہاں ہر چیز پر ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً بہت سے لوگوں نے اس پر ریسرچ کی ہے کہ کامیابی اور ناکامی کیا ہے۔ اور ناکامی کو کس طرح دوبارہ کامیابی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں :

Carole Hyatt, *When Smart People Fail*
Rabbi Harold Kushner, *When Bad Things Happen to Good People*
Charles Garfield, *Peak Performers: The New Heroes of American Business*
Harvey Mackay, *Swim With the Sharks Without Being Eaten Alive*

ان کتابوں میں اپنے موضوع پر قیمتی مواد جمع کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف دو بات نقل کر رہے ہیں۔

ایک بات یہ کہ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی آدمی ہمیشہ کے لیے ناکامی سے محفوظ (Failure-proof) زندگی حاصل کر سکے۔ یہاں بہر حال آدمی کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہر ناکامی کو اپنے لیے سبق کے طور پر استعمال کرے۔ اکثر کامیاب انسانوں کی کامیابی کا راز یہ ملتا ہے کہ جب وہ ناکام ہوئے تو انھوں نے اپنی ناکامی کو آخری لفظ نہیں سمجھا :

(They learnt not to take failure as the last word)

دوسری بات یہ کہ ناکامی کی طرح کامیابی بھی ایک مسئلہ ہے۔ مسلسل کامیابی آدمی کے اندر گھمنڈ (arrogance) پیدا کر دیتی ہے جو خود ناکامی کا ایک مہلک سبب ہے۔ ایک کامیاب تاجر گلن ارلی (Glen Early) نے کہا کہ میں کامیابی پر مغرور بننے کا متحمل نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنی تجارت کو بڑھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں :

I Can't afford to get arrogant about success.
So I'm always trying to improve my business.

کامیابی اور ناکامی کوئی پُراسرار چیز نہیں۔ دونوں معلوم اسباب کے تحت پیش آنے والے واقعات ہیں۔ ان اسباب کو جانئے اور اس کے بعد آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

شکر گزاری

عن ابی ہریرۃ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ (رواہ احمد والترمذی)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو آدمی لوگوں کا شکر نہ کرے وہ خدا کا شکر بھی نہیں کرے گا۔

شکر ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت کسی آدمی کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ منقسم ہو کر نہیں رہ سکتی۔ اگر وہ ایک معاملہ میں ظاہر ہوگی تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اسی قسم کے دوسرے معاملہ میں ظاہر نہ ہو۔ جب آدمی ایک کا شکر گزار ہوگا تو وہ دوسرے کا بھی ضرور شکر گزار ہوگا۔

بندہ کا احسان آنکھ سے دکھائی دیتا ہے، وہ ایک براہِ راست تجربہ ہے۔ اس کے برعکس خدا کا جو احسان ہے وہ ظاہری آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، وہ آدمی کے لیے براہِ راست تجربہ نہیں۔ خدا کے احسان کو سوچ کر جاننا پڑتا ہے۔ بندہ کے احسان کو آدمی بذریعہ مشاہدہ جانتا ہے اور خدا کے احسان کو بذریعہ تفکر۔

جو آدمی براہِ راست مشاہدہ میں آنے والے واقعہ کا احساس نہ کر سکے، وہ ایسے واقعہ کو کیونکر محسوس کرے گا جو بالواسطہ غور و فکر کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

کوئی احسان کرنے والا جب احسان کرتا ہے تو آدمی اس کے احسان کا اعتراف اس لیے نہیں کرتا کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح میں محسن کی نگاہ میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔ حالاں کہ ایسا کر کے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ضمیر کی نگاہ میں چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے نزدیک کم بن جاتا ہے۔ اور بلاشبہ اپنے ضمیر کے نزدیک کم ہونا، دوسرے کے نزدیک کم ہونے سے زیادہ سخت ہے۔

اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ بندوں کے احسان نہ ماننے سے آدمی کے اندر بے اعترافی کا مزاج بنتا ہے۔ اولاً وہ انسان کا اعتراف نہیں کرتا۔ اور اس کے بعد اس کا بگڑا ہوا مزاج اس کو یہاں تک لے جاتا ہے کہ وہ ربّ العالمین کا بھی سچا اعتراف نہیں کر پاتا۔ اور بلاشبہ اس سے زیادہ گھاٹا اٹھانے والا اور کوئی نہیں جو اپنے رب کا اعتراف کرنے سے عاجز رہے۔

حمدِ الٰہی

سب سے بڑی لذت حقیقتِ اعلیٰ کا ادراک ہے۔ آدمی کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ وہ حقیقتِ اعلیٰ کی معرفت حاصل کرے اور اس کو اپنے لفظوں میں بیان کر سکے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں "حمد" کہا گیا ہے۔

خدا اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لیے خدا کی دریافت کسی انسان کے لیے لذت و انبساط کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ آدمی جب اس حقیقتِ کبریٰ کو دریافت کرتا ہے تو اس پر ابتہاج و انبساط کی ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے اعتراف کے جو ربانی کلمات نکل پڑتے ہیں اسی کا نام حمد ہے۔ قرآن کی آیت (الحمد للہ رب العالمین) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

موجودہ دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ اس کو حقیقی معنوں میں الحمد للہ رب العالمین کہنے کی توفیق مل سکے۔ کوئی شخص اُس معرفتِ خداوندی کا تجربہ کرے جو آدمی کے اندرون کو ربانی نور سے روشن کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر حمد و شکر کے نغمے جاری ہو جاتے ہیں۔

تاہم موجودہ دنیا میں ہر چیز ناقص و ناتمام حالت میں ہے۔ اس لیے یہاں جو چیز بھی انسان کو ملتی ہے وہ ناقص و ناتمام حالت میں ملتی ہے۔ اسی طرح معرفتِ الٰہی اور حمدِ خداوندی کی توفیق بھی موجودہ دنیا میں صرف ناقص صورت میں مل سکتی ہے۔ یہاں کسی انسان کے لیے معرفتِ کلّی اور حمدِ کامل کی نعمت ملنا ممکن نہیں۔ یہ سب سے بڑی خوشی ان نادر روحوں کے لیے مقدر ہے جن کو اگلے مرحلۂ حیات میں جنت کا داخلہ دیا جائے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں اہلِ ایمان کہیں گے کہ الحمد للہ رب العالمین (الزمر ۷۵)، اس سے مراد کلمۂ حمد کا وہ اعلیٰ اور کامل اظہار ہے جس کا موقع صرف جنت کی کامل اور معیاری دنیا میں حاصل ہوگا۔

جنت کا انسان کامل ترین صورت میں حقیقت کا ادراک کرے گا، اس لیے وہ کامل ترین صورت میں کلمۂ حمد کا اظہار کر سکے گا۔ یہ برتر لذت کی وہ قسم ہے جو صرف اہلِ جنت کے حصہ میں آئے گی۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ آج کی سطح پر حمدِ خداوندی کا ثبوت دیں گے وہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت کی دنیا میں کل کی سطح پر حمدِ خداوندی کی توفیق پائیں گے۔

خاموشی

عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من صمت نجا۔ یعنی جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۳۶۰) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: الصمتُ حکمٌ وقلیل فاعلُه۔ یعنی خاموشی حکمت ہے۔ مگر بہت کم ہیں جو اس پر عمل کرتے ہوں (المفردات فی غریب القرآن، ۱۲۷)

خاموشی بے عملی نہیں، خاموشی خود ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا صاحبِ دماغ ہونا ہے۔ اور خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی واقعۃً دماغ والا انسان ہے۔ وہ اپنے اندر ذہنی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چپ رہنا سوچنا ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو وہ سادہ طور پر صرف چپ نہیں ہوتا، وہ اس وقت غور و فکر میں مشغول ہوتا ہے۔ اور غور و فکر بلاشبہ سب سے بڑا عمل ہے۔ بولنا اگر اعضاء و جوارح کی حرکت کا نام ہے تو چپ رہنا دماغ کی حرکت کا نام۔ بولنا اگر آدھا عمل ہے تو چپ رہنا پورا عمل۔

چپ رہنا سنجیدگی کی علامت ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے یہ سوچ رہا ہے کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔ وہ دوسروں کو مخاطب بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو مخاطب بنا رہا ہے۔ وہ عاجلانہ اقدام کے بجائے سوچے سمجھے اقدام کا منصوبہ بنانے میں مشغول ہے۔

بولنا بے صبری ہے اور چپ رہنا صبر ہے۔ بولنا بے احتیاطی ہے اور چپ رہنا احتیاط ہے۔ بولنا غیر ذمہ دارانہ انداز ہے اور چپ رہنا ذمہ دارانہ انداز۔ بولنا محدودیت ہے۔ جو آدمی بول دے اس کی گویا حد آگئی، مگر چپ رہنا لامحدودیت ہے۔ جو آدمی چپ ہو وہ اتھاہ آدمی ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کی ابھی حد نہیں آئی۔ بولنے والا آدمی فوراً بول پڑتا ہے، اور چپ رہنے والا آدمی اس وقت بولتا ہے جب کہ تمام لوگ اپنے الفاظ ختم کر چکے ہوں۔

قیمتی چیز ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بولنے والوں سے خدا کی زمین بھری ہوئی ہے، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو چپ رہیں۔ جو بولنے سے زیادہ چپ رہنے کو محبوب رکھتے ہوں۔

علم کا حصول

صحیح مسلم میں کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ (باب اوقات الصلوات الخمس) کے تحت ایک روایت اِن الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

عن عبد اللّٰہ بن یحیی بن ابی کثیر قال سمعتُ ابی یقول: لا یُستطاعُ العلم براحۃِ الجسم

عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ علم جسمانی راحت کے ساتھ نصیب نہیں ہوتا۔

اس حدیث کا اگرچہ اوقاتِ نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بظاہر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ امام مسلم نے اس کو اوقات الصلوٰۃ کے باب کے تحت کیوں نقل کیا۔ تاہم اس سے قطع نظر، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے حصول کے لیے جاں فشانی کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم میں گہری بصیرت اس کے بغیر حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی راحت و آرام سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو علم کے حصول کے لیے وقف کر دے۔

علم کے لیے تحقیق اور مطالعہ انتہائی حد تک ضروری ہے۔ جب آدمی صحیح معنوں میں تحقیق اور مطالعہ میں لگتا ہے تو مصروفیتوں کی ایک پوری دنیا اس کے سامنے کھل جاتی ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کھانا، نیند، آرام اور دوسرے جسمانی تقاضوں کو نظر انداز کیے بغیر وہ اپنے تحقیق اور مطالعہ کے کام کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس وقت جو آدمی علم کا سچا طالب ہو وہ دوسرے تمام تقاضوں کو ثانوی قرار دے کر ہمہ تن علم کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔

مگر یہ بھی صرف ایک ظاہری بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم میں مشغول ہونا خود ایک راحت ہے۔ آدمی جب علم کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو یہ تجربہ اس کے لیے اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ وہ خود ہر قسم کے آرام کا بدل بن جاتا ہے۔ اب جسمانی راحت کو چھوڑنا راحت کو چھوڑنا نہیں ہوتا بلکہ چھوٹی راحت سے نکل کر زیادہ بڑی راحت کو پا لینے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

یہی وہ چیز ہے جو علم کے طالب کے لیے ہر قسم کی بے آرامی کو قابل قبول بنا دیتی ہے۔ وہ بڑی چیز کو پانے کی خوشی میں چھوٹی چیز کے کھونے کو برداشت کر لیتا ہے۔

مستقبل پر نظر

ایک غزوہ میں ایسا ہوا کہ مسلمانوں نے نہ صرف دشمن فوج کے مردوں کو قتل کیا بلکہ ان کے کچھ بچوں کو بھی مار ڈالا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ سخت ناراض ہوئے۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ آج وہ حد سے گزر گئے اور بچوں کو قتل کر ڈالا۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ یہ مقتول بچے کیا مشرکین کے بچے نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے بہترین لوگ مشرکین کی اولاد ہی تو ہیں (انما خیارکم ابناء المشرکین: احمد، نسائی)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کی نظر ہمیشہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ وہ حال سے اوپر اٹھ کر آگے کی طرف دیکھتا ہے۔ حتی کہ حال کی ناموافق باتوں پر اس امید میں صبر کرتا ہے کہ آئندہ نئے امکانات پیدا ہوں گے اور آج کا ناموافق کل کے موافق میں تبدیل ہو جائے گا۔

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ آج جو شخص انکار کر رہا ہے کل وہ اقرار کرنے والا بن سکتا ہے۔ آج جو شخص بظاہر دشمن بنا ہوا ہے اس میں آئندہ ایسی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے اور آپ کا دوست اور ساتھی بن جائے۔ حتی کہ باپ کا رویہ اگر مایوسانہ ہو تو مومن اس کے بیٹے سے امید قائم کر لیتا ہے کہ شاید وہ بڑا ہو کر حق کا اعتراف کرنے والا بن جائے۔

یہ دنیا موافق امکانات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر موافق امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لیے بلند حوصلگی اور عالی ظرفی درکار ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی دشمن اور دوست کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ وہ نفرت اور محبت کے جذبات سے بلند ہو کر رائے قائم کرے۔ اس بلند ہمتی کے بغیر ان امکانات کو استعمال کرنا ہرگز ممکن نہیں۔

ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا باطن۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چیز اپنے ظاہر کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہے اور باطن کے اعتبار سے کچھ اور۔

عام انسان چیزوں کو صرف ان کے ظاہر کی حد تک دیکھتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو چیزوں کو ان کے اندرونی امکانات کے اعتبار سے دیکھنے لگے۔

رضوان اللہ، رضوان العباد

قرآن وحدیث میں بار بار مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ آخرت کے اعتبار سے صرف اس عمل کی قیمت ہے جس میں ابتغاء رضوان اللہ (الحدید ۲۷) کی روح پائی جاتی ہو۔ جو عمل اس روح سے خالی ہو وہ آخرت کی میزان میں کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی انسان کے صرف ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے بارہ میں فیصلہ نہیں کرتا۔ وہ اس کی قلبی حالت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرتا ہے جس کو شریعت میں نیت کہا گیا ہے۔ اس پہلو سے تمام انسانی اعمال کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو رضوان اللہ (اللہ کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ دوسرا وہ جو رضوان العباد (بندوں کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، اس کا رخ ہمیشہ اللہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر معاملہ میں اللہ کی پسند اور ناپسند کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنا رویہ ہمیشہ اصولِ حق کی بنیاد پر متعین کرتا ہے۔ وہ وہی بات بولتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور اسی سمت میں چلتا ہے جدھر اللہ نے چلنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنی اس روش پر قائم رہتا ہے، خواہ تمام انسان اس کے مخالف ہو جائیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں وہ خود اپنے لوگوں سے کٹ جائے۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہوتا ہے جو رضوان العباد کا طالب بنا ہوا ہو۔ اس کی توجہ کا مرکز اللہ کے بجائے انسان بن جاتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی قوم، اپنے حلقہ، اپنی پارٹی اور اپنے دنیوی سرپرستوں کی طرف دیکھتا ہے، وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جو ان انسانوں کو پسند ہوں، وہ ایسے عمل کرتا ہے جو ان انسانوں کے درمیان اس کو مقبول بنانے والے ہوں۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، وہ اللہ کے معاملہ میں آخری حد تک حساس ہوتا ہے۔ وہ ہر دوسرے پہلو کو نظر انداز کر سکتا ہے مگر اللہ والے پہلو کو نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو لوگ رضوان العباد کے طالب ہوں، وہ انسانوں کے بارہ میں سب سے زیادہ حساس بن جاتے ہیں وہ انسانوں کا اس طرح لحاظ کرنے لگتے ہیں جس طرح خدا کا لحاظ کرنا چاہیے۔

اوّل الذکر لوگوں کا مقام جنت ہے اور ثانی الذکر لوگوں کا مقام جہنم۔

بیرونیات، اندرونیات

آدمی کے وجود کی دو سطحیں ہیں۔ ایک باہر کی سطح، اور دوسری اندر کی سطح۔ اسی اعتبار سے انسانی سرگرمیوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بیرونی ڈھانچہ کی سطح پر جاری ہوتی ہے۔ دوسری وہ جو اندرونی کیفیات کی زمین سے ابھرتی ہے۔ اگر نئی اصطلاح بنانا ہو تو ان کو الگ الگ بتانے کے لیے دو لفظ استعمال کیے جا سکتے ہیں ـــــ بیرونیات اور اندرونیات۔ بیرونیات سے مراد وہ سرگرمیاں ہیں جو باہر کی چیزوں پر مبنی ہوں۔ اندرونیات سے مراد وہ سرگرمیاں ہیں جو اندرونی حقیقت کی بنیاد پر وجود میں آئیں۔

اس تقسیم کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سرگرمیوں کو دیکھئے تو وہ سب کی سب بیرونیات سے تعلق رکھنے والی نظر آتی ہیں۔ ان سرگرمیوں میں بظاہر اگرچہ ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہے۔ ان کے نمائندے جو الفاظ بولتے ہیں، وہ بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں لیکن ظاہر سے گزر کر حقیقت کے اعتبار سے جانچئے تو سب کی سب یکساں نظر آئیں گی۔ سب، کسی نہ کسی اعتبار سے، بیرونی چیزوں پر مبنی دکھائی دیں گی۔

جو تحریک بیرونیات کی سطح پر ابھرے، وہ خواہ اسلام کا نام لیتی ہو، مگر وہ ایک دنیا پرستانہ تحریک ہے۔ خدا پرستی کے دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی تحریک یا دینی دعوت وہ ہے جو تمام تر اندرونیات کی بنیاد پر ابھرے۔ جو انسانی شخصیت میں پیدا ہونے والے اندرونی بھونچال کے نتیجہ میں ظہور میں آئی ہو۔

جس کے افراد معرفتِ ربانی کے اندرونی تجربہ کے تحت متحرک ہوئے ہوں۔ جن کے یہاں نطق خاموشی کی صورت میں ڈھل گیا ہو۔ جن کی تنہائیاں فرشتوں کے اَن دیکھے مجمع سے پُر رہتی ہوں۔ جن کے سینہ کا طوفان آنکھ کے آنسوؤں کی صورت میں رواں ہوتا ہو۔ جو چپ کی زبان میں خدا سے ہم کلام ہونے کا راز پا گیے ہوں۔ جن کے لیے واقعات ظاہری بے حقیقت ہو جائیں اور حقائقِ اخروی جن کو پہاڑ سے بھی زیادہ نمایاں صورت میں دکھائی دینے لگیں۔ دل کی دھڑکنیں ہی جن لوگوں کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا درجہ اختیار کر لیں۔

دو بول

آپ امام البخاری کی "صحیح" کو پڑھنا شروع کریں تو جب آپ اس کے خاتمہ پر پہنچیں گے تو آخر میں آپ کو یہ حدیث لکھی ہوئی ملے گی:

عن ابی ھریرۃ۔ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ کلمتان حبیبتان الی الرحمٰن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو بول خدائے مہربان کو محبوب ہیں۔ وہ زبان پر ہلکے ہیں مگر قیامت کی میزان پر بھاری ہیں۔ وہ بول ہیں: سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں بول زمین و آسمان کی تمام چیزوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ وہ قیامت میں اعمال کے ترازو کو جھکا دینے والے ہیں۔ مگر ان بولوں کی یہ اہمیت ان کے تلفظ میں نہیں ہے بلکہ ان کی حقیقت میں ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ وہ جس معنویت کا اظہار ہیں وہ معنویت اپنی اہمیت میں تمام چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

یہ دونوں بول دراصل معرفتِ خداوندی کے بول ہیں۔ ایک شخص کو ایمان کی معرفت حاصل ہوئی۔ اس نے اللہ کی پاک ہستی کا ادراک کیا۔ اس نے دیکھا کہ کائنات اپنے اَن گنت کرشموں کے ساتھ اس کی حمد میں نغمہ سنج ہے۔ اس نے اپنے اندر اور اپنے باہر خدا کی عظمت و جلال کی نشانیاں دیکھیں۔ اس معرفت نے اس کے سینہ میں حمدِ الٰہی اور اعترافِ خداوندی کا طوفان برپا کر دیا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ خدایا تو پاک ہے۔ ساری حمد تیرے لیے ہے۔ تو سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اس کی زبان پر بے اختیار یہ کلمات جاری ہو گئے کہ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اس طرح کا ایک بول محض ایک انسانی بول نہیں۔ وہ خدا کی بے پایاں عظمتوں کا انسان کی زبان سے اظہار ہے۔ وہ تمام باوزن چیزوں سے زیادہ باوزن ہے۔ وہ بلاشبہ اسی قابل ہے کہ جس پلڑے میں رکھا جائے اس پلڑے کو جھکا دے۔

زوال کی علامت

پاکستان کے بزرگ صحافی "م ش" اپنی یادداشتیں شائع کر رہے ہیں۔ اس کی ایک قسط نوائے وقت (۲۱ جنوری ۱۹۹۲) میں چھپی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :

"میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندو اپنے لوگوں کو خواہ وہ مٹی کے بُت ہی کیوں نہ ہوں اپنا دیوتا بنا لیتے ہیں۔ ہندو اخبارات (قبل از تقسیم زمانہ میں) کسی کو مہاتما، کسی کو بھارت پرش، کسی کو دیوتا سروپ کے القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ لیکن مسلم اخبارات ان سے اختلاف رائے رکھنے والے کو ٹوڈی یا جھولی چک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پنڈت مالویہ کانگرس کے مخالف تھے۔ لیکن کسی ہندو اخبار نے انھیں غدار نہیں کہا تھا۔ بلکہ انھیں پوجیہ پاد کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہمارے مذہبی طبقوں میں جس طرح تکفیر کا رواج ہے اسی طرح سیاسی دنیا میں اختلاف رائے کو غداری سے محمول کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے مقابلہ مسلمانوں میں انفرادی حیثیت میں بے مدقد آور شخصیات تھیں لیکن مسلمان حریفوں نے ہمیشہ ان کا چراغ بجھانے کی کوششیں روا رکھیں۔ سرسید احمد خاں پر کفر کے فتوے لگے۔ سر میاں محمد شفیع کو ہمیشہ ٹوڈی کہا گیا۔ اقبال کے متعلق کہا گیا کہ : سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال۔

قائد اعظم کو کافر اعظم کہہ کر یاد کیا گیا۔ عبدالغفار خاں کو عبدالکفار خاں کے نام سے یاد کیا گیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو گالیوں سے نوازا گیا۔ (صفحہ ۸)

یہی انداز آج بھی جاری ہے۔ موجودہ دور پریس کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم علماء اور دانشور حقیقی تنقید سے واقف ہی نہیں۔ وہ تنقید کے نام سے صرف تنقیص کو جانتے ہیں۔ مسٹر اور مولوی، مقدس اور غیر مقدس، بے ریش اور باریش، اصاغر اور اکابر سب کا یہ حال ہے کہ جہاں کسی سے اختلاف ہوا فوراً اس کے خلاف وہ سب دشنام کی زبان بولنے لگیں گے۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ پر یہ انداز اتنا زیادہ چھا چکا ہے کہ اب ان کی بظاہر علمی تنقید بھی حقیقۃً سب دشنام ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہوتی ہے۔

کسی قوم میں یہ مزاج اس کے زوال یافتہ ہونے کی آخری علامت ہے۔ زوال یافتہ قوم کی خاص پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس اظہار خیال کی صرف دو زبان رہ جاتی ہے۔ یا قصیدہ خوانی یا الزام تراشی۔

ایک تبصرہ

انڈیا ٹوڈے (۱۵ مئی ۱۹۹۱) میں ایک مباحثہ (debate) چھپا ہے جو دہلی کے تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان ہوا۔ اس کا موضوع ہندستان میں سیکولرزم (secularism in India) تھا۔ یہ مباحثہ آٹھ گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس سلسلہ میں اجودھیا کی بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔

ٹائمس آف انڈیا کے سابق ایڈیٹر مسٹر گری لال جین نے اس موقع پر بولتے ہوئے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ مسلمان خود اپنی بے وقوفی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ وہ غیر معمولی قسم کے بے وقوف لوگ ہیں۔ وہ ایک ایسے عمارتی ڈھانچہ کے لیے لڑ رہے ہیں جس کی مسجد کی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ مسلمان اگر ہوشیار ہوتے تو وہ بہت پہلے ایک عمارتی ڈھانچہ کے اس وہم کو چھوڑ دیتے اور اس طرح بی جے پی کے نیچے کی زمین اس سے چھین لیتے:

The Muslims are victims of their own stupidity. They are extraordinary stupid people. I don't mind this going on record. To fight for a structure which has ceased to be a mosque! If the Muslims were clever they would have given away this ghost of a structure long ago and taken the earth from under the BJP (p. 137).

مسٹر گری لال جین کے نزدیک، مسلمان ایک غیر موجود مسجد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح اور مطابق واقعہ بات یہ ہے کہ مسلمان ایک موجود مسجد پر غاصبانہ قبضہ کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مسلمان ایک ثابت شدہ تاریخی مسجد پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کی جد وجہد کر رہے ہیں جس پر کچھ سالوں سے ان کا قبضہ باقی نہیں رہا ہے۔

ایک چیز کسی آدمی کی ملکیت ہو اور دوسرا شخص اس پر قبضہ کرے تو اپنی ملکیت کو واپس لینے کے لیے لڑنا مسلّمہ طور پر ایک شریفانہ حق ہے جو تمام دنیا میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یقیناً مسٹر گری لال جین بھی اس کو تسلیم کرتے ہوں گے۔

مثلاً اگر کوئی شخص مسٹر جین کے گھر پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے تو وہ ضرور اس کے لیے لڑیں گے۔ اس وقت اگر کوئی شخص مسٹر جین سے کہے کہ تم بہت بے وقوف ہو۔ تم ایک ایسی چیز کے لیے لڑ رہے

ہو جو تمہاری چیز کی حیثیت سے باقی نہیں رہی، تو مسٹر جین اس کو جواب دیں گے کہ تم خود سب سے بڑے بے وقوف ہو۔ میری چیز پر کوئی شخص غاصبانہ قبضہ کرے تو میں کیوں نہ غاصبانہ قبضہ کو ختم کرنے کے لیے اس سے لڑوں۔ وہ کہیں گے کہ میں کسی غیر موجود مکان کے لیے نہیں لڑ رہا ہوں۔ بلکہ ایک موجود مکان پر غاصبانہ قبضہ کے خلاف لڑ رہا ہوں۔

اگر مسٹر گری لال جین کی دلیل کو مان لیا جائے تو پچاس سال پہلے ہندستان کی آزادی کے لیے جو جد و جہد کی گئی وہ پوری کی پوری بے وقوفی قرار پائے گی۔ مسٹر جین کے مذکورہ اصول کو ماننے کے بعد آخر اس کے حق میں کون سی دلیل باقی رہے گی۔ اس کے بعد ملک کے اوپر سے بدیشی قبضہ کو ہٹانے کے لیے قربانیاں دینا کس منطق سے معقول ثابت کیا جائے گا۔

دنیا کے تمام قانونی نظاموں میں استقرار حق (declaration of title) کے لیے قانون بنائے گئے ہیں۔ مگر مذکورہ نظریہ کو ماننے کے بعد اس قسم کے قوانین سرے سے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے اپنی مغصوبہ ملکیت پر دوبارہ اپنا قبضہ بحال کرنے کا کوئی قانونی جواز باقی نہیں رہتا۔

البتہ مسٹر گری لال جین یا کوئی بھی سمجھ دار آدمی ایسا نہیں کرے گا کہ اس کے گھر پر کوئی شخص غاصبانہ قبضہ کرے تو وہ جوش میں آکر غاصب کو قتل کر ڈالے۔ ایسا کرنا غصب کے کیس پر قتل کے کیس کا اضافہ کرنا ہے۔ اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ البتہ اصل مسئلہ میں مزید پیچیدہ تر مسائل کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

بابری مسجد کے کیس میں اصل غلطی خود کیس کو لے کر اٹھنا نہیں ہے۔ بلکہ کیس کو غلط طور پر لیڈری کا اشو بنانا ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے اس کے حل کے نام پر غلط طریقے اختیار کیے۔ یہی غلط طریق کار ہے جس نے بابری مسجد کے مسئلہ کو موجودہ سنگین صورت حال تک پہنچا دیا۔ اس غلط طریق کار کے نامطلوب نتائج میں سے ایک نامطلوب نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے فرقہ پرست عناصر کو غیر معمولی طور پر ابھرنے کا موقع مل گیا۔

بابری مسجد کے مسئلہ کو ایک جائز اور حقیقی مسئلہ مانتے ہوئے میں کہوں گا کہ بابری مسجد نہیں بلکہ یہ بابری مسجد کے نام پر اٹھنے والے مسلمانوں کے لیڈر ہیں جنھوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کو زمین دی ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اگر ہوشیار ہوتے تو صحیح طریق کار اختیار کر کے یقیناً وہ

بھارتیہ جنتا پارٹی کو اس ملک میں بے زمین کر سکتے تھے۔

بابری مسجد کا اشو ایک حقیقی اشو ہے۔ مگر ۱۹۸۶ میں "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کے نام سے جو تنظیم بنی اور اس نے اس اشو کو جس طرح عوامی اور احتجاجی انداز سے اٹھایا، وہ بلاشبہ احمقانہ بھی تھا اور مہلک بھی۔ نادان مسلم لیڈروں کا یہی طریق کار ہے جس نے بابری مسجد کے مسئلہ کو غیر ضروری طور پر اتنا پیچیدہ بنا دیا۔ بابری مسجد تحریک اپنی موجودہ صورت میں بلاشبہ ایک قسم کی اینٹی بابری مسجد تحریک تھی۔ اس "اینٹی تحریک" میں مسلمانوں کے تمام رہنما شریک ہیں، کوئی براہ راست اور کوئی بالواسطہ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں مسائل پیدا بھی ہوتے ہیں اور مسائل حل بھی کیے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ مسئلہ کا پیدا ہونا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسئلہ کو حل کرنے کا کام نااہل اور نکمے افراد کے حوالے ہو جائے۔ بدقسمتی سے یہی دوسری صورت بابری مسجد کے مسئلہ کے ساتھ پیش آئی ہے۔

غلط لیڈروں کے اسی غلط طریق کار کا یہ نتیجہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی جو ۱۹۸۱ کے الکشن میں ہندستانی پارلیمنٹ میں صرف دو سیٹیں حاصل کر سکی تھی وہ ۱۹۸۹ کے الکشن میں پارلیمنٹ کی ۸۶ سیٹوں پر قابض ہو گئی۔ اور ۱۹۹۱ کے الکشن میں اس نے مزید اضافہ کے ساتھ پارلیمنٹ میں ۱۲۰ سیٹیں حاصل کر لی ہیں۔ نیز ملک کی سب سے بڑی ریاست یوپی میں وہ اس پوزیشن میں ہو گئی کہ وہاں اپنی وزارت بنا سکے۔ یہ وہی ریاست ہے جس کے ایک قصبہ میں بابری مسجد واقع ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ داعیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: یسروا ولا تعسروا، بشروا ولا تنفروا (تم آسانی پیدا کرو، تم مشکل نہ پیدا کرو۔ تم لوگوں کو بشارت دو، تم انھیں متنفر نہ کرو)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک صحیح مقصد ہو تب بھی اس کے لیے کام کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو یسر اور بشارت کے انداز میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو عسر اور نفرت کے انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ بابری مسجد کی تحریک چلانے والے نااہل رہنماؤں نے یہ کیا کہ اس تحریک کو انھوں نے عسر اور نفرت کے انداز میں چلایا، وہ اس کو یسر اور بشارت والے انداز میں نہ چلا سکے، حالانکہ اس کا امکان پوری طرح موجود تھا۔ اس غلط اور غیر اسلامی طریق کار کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مسئلہ تو حل نہیں ہوا، البتہ کچھ مزید سنگین مسائل ملت مسلمہ کے لیے پیدا ہو گئے۔

قومی یک جہتی کا مسئلہ

قومی یک جہتی کی اہمیت سب سے پہلے ہندستان کے سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے محسوس کی۔ انھوں نے اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کانفرنس بلائی۔ اس کا اجلاس نئی دہلی میں ۲۸ ستمبر تا یکم اکتوبر ۱۹۶۱ کو ہوا۔ اس کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق، اس خاص مقصد کے لئے ایک مستقل تنظیم نیشنل انٹگریشن کونسل (قومی یک جہتی کونسل) کے نام سے قائم کی گئی۔

اس کونسل کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ تمام متعلقہ مسائل کا جائزہ لے کر ضروری سفارشیں حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اس کے مطابق، اس کا اجلاس ۲-۳ جون ۱۹۶۲ کو ہوا۔ اس اجلاس نے طے کیا کہ لسانی تعصب، علاقائی علیحدگی پسندی اور فرقہ واریت، یہ تین چیزیں قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے ان رکاوٹوں کو دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے۔

۱۹۶۲ کے اس اجتماع کے بعد کئی سال تک نیشنل انٹگریشن کونسل کی کوئی مزید سرگرمی نہ ہو سکی۔ آخر کار مسز اندرا گاندھی نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۲۰-۲۱ جون ۱۹۶۸ کو سرینگر میں اس کا اجلاس بلایا گیا۔ سرینگر کی ٹھنڈی فضا میں نیشنل انٹگریشن کونسل کا یہ اجلاس ختم ہوا تو لوگوں نے اس سے کافی امیدیں وابستہ کیں۔ نارد رن انڈیا پترپکا (۲۳ جون ۱۹۶۸) نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی کہ فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے دور رس اقدامات:

Far-reaching steps to end communalism.

سرینگر کے اجلاس میں نیشنل انٹگریشن کونسل نے کچھ سفارشات اتفاق رائے سے منظور کیں۔ ان سفارشات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً حکومت اس مقصد کے لئے سراغ رسانی کے خصوصی یونٹ قائم کرے۔ اس معاملہ میں جو سرکاری افسران اپنے فرائض سے کوتاہی کرتے ہوئے پائے جائیں ان کو سزا دی جائے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کی سماعت کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ میں ترمیم کر کے فرقہ وارانہ سرگرمیوں کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ سرکاری ملازمین کی بھرتی میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا

جائے۔ تیوہاروں کو مشترک طور پر منانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ وغیرہ

اس طرح قومی یک جہتی یا نیشنل انٹگریشن کی کوششوں پر اب ۳۰ سال گزر چکے ہیں۔ مگر اب تک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس مدت میں قومی کشیدگی اور قومی اختلافات اس سے بھی زیادہ ہو گئے جو ۳۰ سال پہلے ہمارے ملک میں پائے جاتے تھے۔

میں نے اس موضوع پر کافی غور کیا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے ملکوں کے حالات کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ آخر کار میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی نہ ہونے کا جو اصل سبب ہے اس کو دور کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ملک کے اندر قومی جہتی کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور وہ سبب ہے شعور کی کمی۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے عام طور پر جو تجویزیں پیش کی جاتی ہیں وہ تقریباً سب کی سب سسٹم یا نظام سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر اس طرح کی سماجی خرابیاں سسٹم کے بدلنے سے درست نہیں ہوتیں۔ ان خرابیوں کا تعلق تمام تر افراد سے ہے۔ یہ دراصل افراد ہیں جو سسٹم کو چلاتے ہیں۔ اس لئے سسٹم کو درست کرنے کے لئے افراد کو درست کرنا ہوگا۔

کسی سماج کا درست ہونا تمام تر اس پر منحصر ہے کہ اس کے افراد کا مزاج درست ہو۔ مثال کے طور پر جاپان کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ ان کے اوپر کوئی سردار مقرر کیا جائے تو وہ فوراً اس کی ماتحتی کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس لئے جاپان کے سماج میں اتحاد ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ وہ کسی کی ماتحتی کو قبول نہیں کرتے، اس لئے ہمارے ملک کے سماج میں اتحاد نہیں۔

میں نے اس سلسلہ میں جاپان کی تاریخ کا کافی مطالعہ کیا۔ میں نے پایا کہ جاپان میں یہ مزاج تعلیم کے ذریعہ آیا۔ جاپان میں ہر شخص تعلیم یافتہ ہے۔ مزید یہ کہ اسکول کی سطح پر ان کے یہاں تعلیم کا نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ اس طرح جاپان کا ہر شخص نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ وہ شعوری حیثیت سے بیدار ہے اور اپنے اندر تعمیری ذہن رکھتا ہے۔

اس مطالعہ کے بعد، نیز دوسرے تاریخی پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد میری قطعی رائے ہے کہ ہندستان کے سماجی جھگڑوں کا واحد حل یہ ہے کہ قوم کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ قوم

کے ہر فرد کے اندر تعمیری شعور پیدا کیا جائے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن ملک کے اندر وہ چیز بھی پیدا ہو جائے گی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

اس نظریہ کی صحت کی ایک مثال خود ہمارے ملک میں موجود ہے۔ ہندستان میں عمومی سطح پر لٹریسی، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے بیان کے مطابق ۳۶ فیصد ہے۔ مگر ہندستان کی ایک جنوبی ریاست کیرلا میں لٹریسی تقریباً صد فی صد تک پہنچ چکی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ بقیہ ہندستان میں طرح طرح کے جھگڑے جاری رہتے ہیں۔ مگر کیرلا کی ریاست سماجی جھگڑوں سے تقریباً پاک ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ تعلیم کی کمی سے شعوری ناپختگی پیدا ہوتی ہے۔ اور تعلیم کا اضافہ لوگوں کے اندر شعوری بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور جہاں شعوری بالیدگی آجائے وہاں غیر ضروری جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

تمام ترقی یافتہ ملکوں میں لازمی تعلیم کا اصول رائج ہے۔ ہر ترقی یافتہ سماج میں گورنمنٹ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ہر شخص کو تعلیم یافتہ بنائے۔ چنانچہ ان قوموں اور سماجوں میں ہر آدمی تعلیم یافتہ ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس نے ترقی یافتہ سماج اور پس ماندہ سماج میں وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

انڈیا میں ابھی لازمی تعلیم کے اصول کو رائج نہ کیا جا سکا۔ آزادی کے بعد دستور ہند میں اس سے کمتر درجہ میں ایک معیار طے کیا گیا تھا۔ مگر اس کو بھی ابھی تک زیر عمل نہ لایا جا سکا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اس کو ان الفاظ میں ریکارڈ کیا ہے ـــــ انڈیا اِس دستوری ہدایت کو زیر عمل لانے میں ناکام رہا ہے کہ وہ چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے تمام بچوں کے لئے عمومی تعلیم کا انتظام کرے:

India has failed to carry out the constitutional directive of providing universal education for children in the age group of six to 14. (6/394)

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستانی سماج میں قومی یک جہتی پیدا نہ ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے۔ ہمارا سماج تعلیم میں پچھڑا ہوا ہے۔ اس لئے وہ شعور میں پچھڑا ہوا ہے۔ اور جو قوم شعور میں پیچھے ہو جائے وہ سماجی

تعمیر میں بھی اسی نسبت سے پیچھے ہو جائے گی۔

تاہم اس کام کو صرف حکومت پر چھوڑنا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ہندستانی کو اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے۔ ایک آدمی اگر صرف ایک آدمی کو پڑھا سکتا ہے تو وہ ایک آدمی کو پڑھائے۔ ایک آدمی ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے تو وہ ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ کچھ لوگ اسکول اور کالج کھولنے کی طاقت رکھتے ہوں تو وہ اسکول اور کالج کھول کر نوجوانوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ غرض ہر آدمی اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے اس مہم میں شریک ہو جائے۔

جب یہ تعلیمی مہم کامیاب ہوگی اور قوم صد فی صد تعلیم یافتہ ہو جائے گی تو اس وقت نہ صرف ملک میں قومی یک جہتی آچکی ہوگی بلکہ مزید تمام اوصاف کو حاصل کر کے ہمارا سماج ایک ترقی یافتہ سماج بن جائے گا جس کا ہم پچھلے پچاس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔

ایک اور پہلو

۳۰ برس کی کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں قومی ایکتا نہیں آئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ قومی ایکتا لانے کا جو طریقہ اپنایا گیا وہ درست نہ تھا۔

اس مدت میں ملک کے لیڈروں اور دانشوروں پر یہ خیال چھایا رہا ہے کہ "ایکتا" لانے کے لئے "انیکتا" کو ختم کرنا پڑے گا۔ اسی ذہن کے تحت اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ ملک میں سول میرج کا قانون نافذ کیا جائے۔ تمام لوگوں کو ایک کلچر میں ڈھال دیا جائے۔ جو لوگ زیادہ انتہا پسند ہیں وہ پرجوش طور پر کہتے ہیں کہ تمام لوگ رام کو اپنا پرودج مانیں۔ تمام لوگ اپنے کو ہندو کہیں۔ وغیرہ۔ اس کو یہ حضرات ہندنید (Indianisation) کہتے ہیں۔ مگر اس قسم کی یکسانیت عملاً ناممکن ہے۔ اس لئے وہ اب تک وقوع میں بھی نہ آسکی۔

کناڈا قومی ایکتا کے لئے ایک مثالی ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالاں کہ کناڈا میں اسی طرح مختلف مذہب اور تہذیب کے لوگ رہتے ہیں جس طرح ہندستان میں۔ کناڈا میں یہ قومی ایکتا جس طرح حاصل کی گئی ہے، اس کو وہ لوگ کثیر کلچریت (multiculturalism) کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مختلف فرقوں میں ایکتا لانے کے لئے یکساں کلچر (uniculturalism) کی تحریک نہیں چلائی۔ بلکہ وسیع تر قومی ڈھانچہ کے اندر ہر ایک کی جداگانہ اکائی کو مان لیا۔ اسی اصول پر چل کر کناڈا ترقی

کر رہا ہے۔ ہندستان کی ترقی بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ وہ اس آزمودہ طریقہ کو اپنے یہاں اختیار کر لے۔

۱۳ نومبر ۱۹۹۱ کو شولاپور (مہاراشٹر) میں قومی ایکتا کے موضوع پر ایک اجتماع تھا۔ اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ شولاپور کی ایک معروف شخصیت اور سابق ایم ایل اے شری تلسی داس جادھو نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس نقطۂ نظر کی حمایت کی کہ اصل چیز موافقت اور رواداری کا مزاج ہے۔ اگر یہ مزاج ہو تو بڑے بڑے اختلاف کے باوجود باہمی میل ملاپ قائم ہو سکتا ہے۔

انھوں نے اپنے گھر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے اور میری ماں ویجیٹیرین تھی۔ اس کے باوجود دونوں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے کہ میری ماں روزانہ صبح اٹھ کر نہاتیں اور میرے باپ کے لئے میٹ بنا کر اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نہاتیں اور اپنے لئے دال سبزی والا کھانا بناتیں۔ اسی طرح وہ آخر عمر تک کرتی رہیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں دونوں کے درمیان اتنا بڑا اختلاف تھا۔ مگر دونوں زندگی بھر عزت اور محبت کے ساتھ مل کر رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خاندانی ایکتا ہو یا قومی ایکتا، ہر ایک کا تعلق ذہنی رویہ (mental attitude) سے ہے نہ کہ کلچر کی کیمیائیت سے۔ انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ حتی کہ ایک گھر کے اندر چند آدمی ہیں تو ان میں بھی طرح طرح کا اختلاف ہوگا۔ اس کا حل اختلاف کو مٹانا نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف کو گوارا کرنا ہے۔ اختلاف کو مٹانے کی کوشش اختلاف کو بڑھاتی ہے۔ جبکہ اختلاف کو گوارا کرنے کی پالیسی اختلاف کو عملاً ختم کر دیتی ہے۔

علماء کا اجتماع

یہ طے کیا گیا ہے کہ ملک کے علماء کا ایک اجتماع کیا جائے جو الرسالہ کے قاری اور اس سے متعلق ہوں۔ بقیہ تفصیلات کا اعلان انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔ شرکت کے خواہش مند حضرات اپنے نام اور پتہ سے آگاہ فرمائیں۔

منیجر الرسالہ دہلی

دعوت الی اللہ

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ مسلمانوں کو پیغمبر کی نیابت میں وہی کام انجام دینا ہے جو پیغمبر نے اپنی زندگی میں براہ راست انجام دیا تھا (لیکون الرسول شھیداً علیکم وتکونوا شھداء علی الناس)

یہ کام شہادت علی الناس اور دعوت الی اللہ ہے۔ اس سے مراد نہ حکومت اسلامی کا قیام ہے اور نہ حضارت اسلامی کا احیاء۔ اس کا مقصد تمام تر انذار و تبشیر ہے۔ اس کا نشانہ یہ ہے کہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام اس حد تک پہنچ جائے کہ کسی کے لئے قیامت کے دن کوئی عذر باقی نہ رہے (رسلا مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل)

اسلام میں حکومت اور اقتدار کی حیثیت شئی آخر کی ہے۔ وہ امر مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ایک امر موعود ہے (وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض) اہل ایمان کو اجر آخرت کے محرک کے تحت دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہے۔ البتہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس عمل کے دوران ایسے حالات پیدا کر دے گا جو اہل ایمان کو ذروی غلبہ تک پہنچانے والے ہوں۔

اللہ کی نصرت کے تمام وعدے عمل دعوت کی انجام دہی پر موقوف ہیں۔ اسی میں ملت اسلامیہ کی فوز و فلاح ہے۔ اسی میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے۔ حتی کہ امت محمدی کا امت محمدی ہونا عند اللہ اسی وقت متحقق ہوتا ہے جبکہ وہ دعوت الی اللہ کے اس کام کو انجام دے (المائدہ ۶۷)

اس کام کی صحیح ادائگی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ یہ رشتہ قائم کرنے کی ایک بھاری قیمت دینی لازمی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان مدعو قوموں کی زیادتیوں اور ایذا پر یک طرفہ صبر کریں۔ اس کے بغیر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا (ولنصبرن علی ما آذیتمونا)

مسلمانوں کے جو قومی مسائل ہیں ان کے لئے کچھ لوگ علیحدہ پلیٹ فارم بنا سکتے ہیں مگر اس طرح

کے امور کو دعوت کا عنوان دینا دعوت کی نفی کرنا ہے۔ ان مسائل کا حقیقی حل یہ نہیں ہے کہ ان کو دعوت کی فہرست میں شامل کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ہم کو یہ یقین و اعتماد پیدا کرنا ہوگا کہ اگر ہم دعوت کا کام انجام دے دیں تو اس کے بعد ہمارے مسائل بھی لازمی طور پر حل ہو جائیں گے۔

مسلم ملکوں میں قانون اسلامی کے نفاذ یا غیر اسلامی حکمرانوں کے اخراج کے نام پر اسلامی جماعتوں اور قائم شدہ حکومت کے درمیان جو نزاع جاری ہے اس کو مکمل طور پر ختم کرنا ضروری ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں اسلامی تحریک غیر ضروری طور پر مسلم حکمرانوں کی حریف بن گئی ہے اور مسلم حکومتوں کا وہ تعاون اسلامی دعوت کے عمل کے لئے نہیں مل رہا ہے جو معتدل حالات میں ملنا یقینی تھا۔ مسلم ملکوں کے لئے صحیح اسلامی طریق کار یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ممکن مواقع کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

ضروری دعوتی پروگرام

۱ قرآن و حدیث اور سیرت کے ترجمے تمام زبانوں میں شائع کر کے عالمی سطح پر پھیلانا۔ یہ ترجمے صحیح اور معیاری زبان میں ہوں۔

۲ جدید عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر ہر زبان میں تیار کرنا اور ان کو وسیع پیمانہ پر پھیلانا۔ اس لٹریچر کو مثبت اور موضوعی انداز میں ہونا چاہئے۔

۳ ایسے اجتماعات منعقد کرنا جن میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا گیا ہو۔ ان اجتماعات میں صرف دعوتی کلام کیا جائے۔ اقوام عالم کی عداوتوں اور سازشوں پر شکایات و احتجاج سے آخری حد تک پرہیز کیا جائے۔

۴ ایسے ادارے کا قیام جہاں مسلم نوجوانوں کو دعوتی انداز میں تربیت دی جائے اور ان کو داعی کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے تیار کیا جائے۔

۵ دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کا سالانہ یا اس سے کم مدت میں اجتماع کیا جائے تاکہ ایک کے مشورہ اور تجربہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچ سکے۔

۶ مسلمانوں میں دعوتی ذہن اور تعمیری طرز فکر پیدا کرنے کے لئے مستقل جرائد مختلف زبانوں میں جاری کرنا۔ ان جرائد کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو ہر قسم کے غیر دعوتی مباحث سے یکسر پاک رکھا جائے۔

صغیر اسلم صاحب اور ان کے بچے امریکہ کے شہری بن چکے ہیں۔ ان کی اہلیہ نے ابھی شہریت نہیں لی تھی۔ ۲۸ نومبر کی صبح کو وہ لوگ شہریت کی کارروائی مکمل کرنے کے لئے لاس اینجلیز کے متعلقہ آفس میں جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس "تاریخی منظر" کو دیکھوں۔ چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

امریکی شہریت دینے کی تقریب (ceremony) سال میں دو بار کی جاتی ہے۔ کنونشن سنٹر پہنچا تو وہاں ہزاروں انسانوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ تمام امیدوار صبح سویرے اپنے گھروں سے نکل کر یہاں پہنچے تھے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے اس موقع کو کھو دیا تو دوسرا موقع چھ مہینے کے بعد آئے گا۔

خاص راستوں سے گزارتے ہوئے تمام لوگ ایک بہت بڑے ہال میں لے جائے گئے جہاں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف شہریت کے امیدوار اور دوسری طرف وزیٹرس بٹھا دیے گئے۔ اسٹیج سے اس تقریب (ceremony) کی اہمیت بتائی جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک سفید فام جج آکر صدارت کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے امیدوار لوگوں نے امریکہ کا ایک چھوٹا سا کاغذی جھنڈا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لہرایا۔ جج نے آپ کی زندگی کے اس تاریخی دن (This historic day of your life) کے الفاظ سے آغاز کرتے ہوئے کچھ ضروری باتیں کہیں۔ اس کے بعد اس نے حلف کے انگریزی الفاظ کہے اور ہر ایک نے اس کو بلند آواز سے دہرایا۔ اس کی تکمیل کے بعد جج نے اعلان کیا کہ اب یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کے شہری ہیں۔ آخر میں سب لوگوں کو کھڑا کر کے نیشنل انتھم بجایا گیا۔ معلوم ہوا کہ تین دنوں کے اندر صرف لاس اینجلیز کے سات ہزار آدمیوں کو امریکہ کا شہری بنایا گیا ہے۔

اب ہم لوگ ہال سے باہر کر دیے گئے۔ کچھ دیر کے بعد نئے امریکی شہری ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں سفید کاغذ کا ایک بڑا لفافہ تھا۔ اس میں شہریت کا سرٹیفکٹ اور دوسرے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی چمک رہی تھی۔ کوئی لفافہ کو سنبھال رہا تھا، کوئی اپنے ساتھی کو سرٹیفکٹ نکال کر دکھا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ میں امریکی جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں شہریت کا سرٹیفکٹ لئے ہوئے فوٹو کھنوا رہے تھے۔

میں ایک طرف کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس میں مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کے مرد اور عورت شامل تھے۔ اچانک ایک شخص نے میری طرف بڑھ کر کہا: السلام علیکم۔ یہ محمد جاوید الٰہ آبادی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے بھی آج یہاں آکر امریکہ کی شہریت لی ہے۔ میری مسلمان صورت دیکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔ انھوں نے سامنے کی بھیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس سٹی زن شپ میں کیا دھرا ہے، اصلی سٹی زن شپ تو مرنے کے بعد والی ہے۔

ان کا یہ جملہ سن کر مجھ پر عجیب تاثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ امریکہ کی شہریت لینے کے لئے لوگ کہاں کہاں سے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ مگر جنت کا شہری بننے سے کسی کو دل چسپی نہیں۔ جنت کا شہری بنانے کی کھڑکیاں امیدواروں کی قطار سے خالی ہیں۔

یہاں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ کا اقتصادی نظام تو عربوں کی دولت پر چل رہا ہے۔ عربوں کی جو دولت یہاں کے بینکوں میں جمع ہے اور یہاں کی مختلف کمپنیوں میں عربوں کا جو سرمایہ لگا ہوا ہے، اس کو اگر وہ نکال لیں تو امریکہ دیوالیہ ہو جائے گا۔

دوسری طرف میری ملاقات ایک ہندو انجنیر مسٹر منن سے ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ کو تو ہندو ماہرین چلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکی سائنس دانوں کی بہت بڑی تعداد در اصل ہندستانی ہے۔ اور یہی امریکہ کی بڑائی کا راز ہے۔ وہ ہر ملک کے بہترین افراد کو اپنی طرف کھینچ کر لاتا ہے اور ان کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے:

A large number of American scientists are in fact Indian. And that is part of America's greatness. It attracts, absorbs and assimilates the best from every land.

یہ مشابہت بھی کیسی عجیب ہے کہ ہندو یا مسلمان کوئی بھی خود "اپنے ملک" کو ترقی نہ دے سکا، البتہ دونوں اس بات پر فخر کر رہے ہیں کہ وہی ہیں جنھوں نے "دوسرے ملک" کو اعلیٰ ترقی کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ملک دونوں کے نزدیک قابل مذمت سامراجی ملک ہے۔

امریکہ میں قیام کے دوران میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ یہاں کی ایک مسجد میں امام ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مذکورہ مسجد سے تعلق رکھنے والے مسلمان ان کے خلاف ہو گئے ہیں اور ان کو مسجد کی امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق، اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک بار جمعہ کی تقریر میں صدام حسین کی مذمت کی تھی، اور خلیج کے معاملہ میں سعودی موقف کی حمایت کی تھی۔

یہ کوئی انفرادی بات نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیج کے موجودہ بحران میں مسلم دنیا کی اکثریت صدام حسین کی حامی ہے۔ علماء کی اکثریت نے اگرچہ صدام حسین کو غلط ٹھہرایا ہے، مگر مسلم عوام کی اکثریت اس معاملہ میں پرو صدام نقطۂ نظر رکھتی ہے۔

صدام حسین کا کویت پر حملہ واضح طور پر جارحیت ہے۔ صدام حسین نے کویت میں داخلے کے بعد بیحد طور پر مسلمانوں پر سنگین مظالم کئے ہیں۔ ان سب کے باوجود کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد صدام حسین کی مذمت نہیں کرتی، بلکہ ان کو ہیرو کا مقام دئے ہوئے ہے۔

اس وجہ مسلمانوں کی شکست خوردہ نفسیات ہے۔ مسلمان ایک سو سال سے اس حساس میں مبتلا ہیں کہ مغربی قوموں نے ان کے وقار کو مجروح کیا۔ ان کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔ ان کی تہذیب کو مٹا ڈالا۔ اس شکست خوردگی کی بنا پر جب بھی وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص ان کے "دشمنوں" کو چیلنج کر رہا ہے تو اس سے انھیں ایک قسم کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ایسا آدمی ان کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے۔ یہی نفسیات ہے جس کی بنا پر موجودہ صدی کے آغاز میں کمال اتاترک مسلمانوں کے ہیرو بن گئے۔ اس کے بعد جمال عبد الناصر، معمر قذافی، آیات اللہ خمینی، ٹھیک اسی بنا پر ان کے ہیرو بنتے رہے ہیں۔ اور اب اسی بنا پر انھوں نے صدام حسین کو اپنا ہیرو بنا رکھا ہے، کیوں کہ کم از کم الفاظ کی حد تک، وہ "دشمن اکبر" امریکہ سے چیلنج کی زبان میں بات کر رہا ہے۔

یہ خوش خیالیوں کی دنیا میں کسی کو ہیرو بنا کر اپنی مفروضہ فتح پر خوشی منانا ہے۔ ایسی مفروضہ فتح کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ اس دنیا میں حقائق کی قیمت ہے نہ کہ مفروضات کی۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق نے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا تھا۔ نومبر کے خاتمہ پر اس کے قبضہ

کو چار مہینے پورے ہو جائیں گے۔ اس مدت میں امریکہ کی قیادت میں مختلف ملکوں نے عراق سے مطالبہ جاری کر رکھا تھا کہ وہ بلا شرط کویت کو خالی کر دے۔ سوویت یونین اس معاملہ میں امریکہ کے ساتھ تھا، مگر شرائط اور تحفظات کے ساتھ۔ روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۲۷ نومبر ۱۹۹۰) میں صفحہ اول پر یہ سرخی پڑھی کہ سوویت یونین اب تحفظات کو ختم کر کے امریکہ کا حامی ہو گیا ہے۔ اس خبر کی سرخی ہے ـــــ عراق کے لئے ایک آخری موقع:

final opportunity for Iraq

خبر میں بتایا گیا تھا کہ سوویت یونین کے پریسیڈنٹ میخائیل گورباچیف نے الٹی میٹم کی زبان میں بولتے ہوئے کہا کہ عراق جنوری ۱۹۹۱ تک کویت سے اپنی فوجیں واپس بلائے ورنہ جنگی کارروائی کا سامنا کرے۔ انگریزی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ عراق کی قسمت اس کی قیادت کے ہاتھ میں ہے، اور وقت اب اس کے لئے ختم ہو رہا ہے:

The fate of Iraq is in the hands of its leadership.
Time is running out.

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ اگر معاملہ کو وسیع تر معنوں میں لیا جائے تو یہ وارننگ نہ صرف صدام حسین کے لئے ہے بلکہ گورباچیف، جارج بش اور تمام دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہے۔ ہر ایک کے لئے وقت ختم ہو رہا ہے۔ ہر ایک اس لمحہ کی طرف بڑھ رہا ہے جب کہ خدا کا صور پھونک دیا جائے اور ہر آدمی کو وہاں کھڑا کر دیا جائے جہاں اس کے لئے صرف اپنے کئے کا انجام پانے کا موقع ہو، سرکشی کرنے کا موقع کسی کے لئے باقی نہ رہے۔

یہاں کے اخبارات کا طریقہ ہندستانی اخبارات سے مختلف ہے۔ یہاں کا اخبار سیکڑوں صفحات کا ایک بنڈل ہوتا ہے۔ مگر وہ ایک کتاب کی صورت میں نہیں ہوتا۔ اس کے الگ الگ بہت سے سکشن ہوتے ہیں۔ مثلاً ورلڈ نیوز، ٹریول، اسپورٹس، میٹرو، وغیرہ۔

۲۵ نومبر کو میں روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر کا سکشن ہوم فائنڈر دیکھ رہا تھا۔ اس کے صفحہ ۳ پر ایک ہنستی ہوئی تصویر تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا "وجے سونی"۔ مسٹر سونی دہرہ دون میں ۱۹۴۴ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سول انجینئرنگ میں ماسٹر ڈگری لی۔ ایک

عرصہ تک انڈیا میں کام کرنے کے بعد ۱۹۸۲ میں وہ امریکہ چلے گئے۔ اب وہ آرینج کاؤنٹی میں مقیم ہیں۔ (ٹیلیفون 5598451) وہ جائداد (real estate) کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کیلی فورنیا میں اس کام میں نمبر ۲ کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ وہ اپنی کامیابی کا کریڈٹ سب سے زیادہ ڈیل کارنیگی کو دیتے ہیں جس کی درج ذیل کتاب انھوں نے بار بار پڑھی ہے:

How to Win Friends and Influence People.

انھوں نے کہا کہ میں اپنے گاہک کی بات کو نہایت غور سے سنتا ہوں اور اس کی ہر بات کا نقطہ نوٹ کرتا جاتا ہوں۔ میرے بستر پر مستقل طور پر ایک نوٹ بک موجود ہوتی ہے۔ تاکہ رات کے وقت اگر ٹیلی فون پر کوئی پیغام ملے تو اسی وقت میں اس کو لکھ کر محفوظ کرلوں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۹۰ء کے لئے میرا نشانہ ۲۵ ملین ڈالر ہے:

My goal for 1990 is $25 million.

ہر آدمی حقیقی کے نام پر غیر حقیقی (non-real) کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے، اس دنیا میں کوئی نہیں جو واقعی معنوں میں حقیقی (real) کو اپنا نشانہ بنانے پر تیار ہو۔

یہاں کے لوگوں میں یہ ذوق ہے کہ وہ اپنی کار کے پیچھے نمبر پلیٹ کے اوپر کچھ پسندیدہ فقرے لکھ دیتے ہیں۔ اس طرح کی کئی گاڑیاں میں نے دیکھیں۔ چند گاڑیوں پر لکھے ہوئے جملے یہ تھے:

Sex is like credit. Some get it. Some don't.
Happiness is being a grandparent.
Get rich on life, not drugs.

غالباً بوڑھے لوگ اس قسم کے فقرے اپنی گاڑیوں پر لکھتے ہیں، انسانوں میں انھیں کوئی نہیں ملتا جس سے وہ کامیابی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکیں۔ اس لئے وہ وہ اپنی مشین پر ایسے نقش کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

۷ دسمبر ۱۹۹۰ کی شام کو یہاں سے واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ لاس اینجلز ایئرپورٹ پہنچا۔ اندر داخل ہوا تو ایک منظر میرے لئے بڑا عجیب تھا۔ ایک جاپانی خاتون

بہت بڑا سا ایک "لڑکا" اپنے سینہ سے لگائے ہوئی تھی۔ لڑکے کے موٹے موٹے ہاتھ اور پاؤں لٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اتنے بڑے لڑکے کا بوجھ وہ کیسے اتنی آسانی کے ساتھ اٹھائے ہوئے ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ زندہ لڑکا نہیں ہے بلکہ کسی بھی چیز سے بنی ہوئی بہت بڑی گڑیا ہے۔ ماڈرن عورت لڑکا پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ مگر وہ اولاد کی فطری طلب کو بھی اپنے اندر سے نکال نہ سکی۔ حقیقی اولاد سے محرومی کی تلافی وہ مصنوعی اولاد کے ذریعہ کر رہی ہے۔

ایئرپورٹ کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے سے پہلے، قاعدہ کے مطابق، ہمارا سامان ایک مخصوص قسم کی متحرک بیلٹ پر رکھا گیا۔ اور اس پر چلتا ہوا اندرونی حصہ میں پہنچ گیا۔ اسی طرح تمام لوگوں کے سامان اس کے اوپر رکھ کر گزارے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو اوپر لگی ہوئی اسکرین میں ہر چیز کی صاف تصویر آ رہی تھی۔ بکس مکمل طور پر بند تھا۔ مگر اس کے اندر جو چیز تھی، مشین اس کی تصویر لے کر اسکرین کے اوپر اس کو منعکس کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح خدا ہر ایک کی اندرونی حالت کو دیکھ رہا ہے۔ آدمی خواہ بند کمرہ میں کوئی عمل کرے یا اپنے سینہ کے اندر کوئی بات سوچے، خدائے عالم الغیب سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔

لاس اینجلیز سے جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۶۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہاں کے ایئرپورٹ پر تقریباً ہر وقت کوئی جہاز اترتا ہے یا اڑ رہا ہوتا ہے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے دوری کے مسئلہ کو اس طرح ختم کر دیا ہے کہ اب زمین کے ایک حصہ اور اس کے دوسرے حصہ کے درمیان ربط قائم کرنا اتنا ہی آسان ہو گیا ہے جتنا کسی محلہ کے ایک حصہ اور دوسرے حصہ میں۔ اس مواصلاتی انقلاب سے لوگ زبردست سیاسی اور تجارتی فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ مثلاً جاپان اور امریکہ کے درمیان ہر روز ۱۲ فلائٹ آتی ہے اور ۱۲ فلائٹ جاتی ہے۔ مگر اس مواصلاتی انقلاب کو اب تک اشاعت حق کے لئے استعمال نہ کیا جا سکا۔

راستہ میں ایئر ہوسٹس اخبار لے کر آئی۔ میں نے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں بظاہر بہت سے اخبار تھے۔ میں نے چاہا کہ ان میں سے ایک لے لوں۔ اس نے کہا کہ یہ سب ایک ہی اخبار ہے یہ لاس اینجلیز ٹائمس (۷ دسمبر ۱۹۹۰) تھا۔ میں نے گنا تو اس کے کل ۱۸۰ صفحات تھے۔ یہی امریکی اخبارات کا عام انداز ہے۔ وہ اخبار سے زیادہ اشتہارات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

وہ اتنے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ میگزین (Winds) کے شمارہ دسمبر ۹۰ء کو دیکھ رہا تھا۔ ضخیم میگزین کا بیشتر حصہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک صفحہ پر یہ الفاظ درج تھے:

If you've got a minute, Minolta's got a copier

یہ کاپی کرنے والی مشین کا اشتہار تھا۔ اس میں چھوٹی بڑی مشینوں کی تصویریں تھیں ـــــ ۱۵ کاپی فی منٹ، ۳۰ کاپی فی منٹ، ۴۰ کاپی فی منٹ، ۶۰ کاپی فی منٹ۔ اس کو دیکھ جناب صفی قریشی صاحب کی بات یاد آئی کہ موجودہ سوسائٹی انسٹینٹ فکس سوسائٹی ہے۔ انسٹینٹ کافی کی طرح ہر کام فوری طور پر ہوتا ہے۔ اس سے جدید انسان فوری حل کا عادی ہو گیا ہے۔ یہ آخرت کا پیغام دینے والی تحریک کے لئے ایک نفسیاتی رکاوٹ ہے۔ انسان اپنے مسئلہ کو "آج" حل کرنا چاہتا ہے، اور آخرت کا نظریہ اس کو "کل" تک موخر کر رہا ہے۔

یہ بڑا جہاز (۷۴۷) تھا۔ مگر چند کو چھوڑ کر اس کے تمام مسافر جاپانی تھے۔ جہاز کے اندر کامل سکون نظر آیا۔ ہندستانی مسافر جس جہاز میں ہوں، اس کے اندر شور لازمی ہے۔ ٹائیلٹ میں جائیے تو گندا کیا ہوا ملے گا۔ نیچے جہاز کے اندر دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر موجودہ جہاز میں اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ اکثر مسافر پڑھتے یا لکھتے ہوئے دکھائی دئے۔ جاپانیوں کا یہی مزاج جاپانیوں کا اصل سرمایہ ہے۔ ان کی ترقی کا اصل راز ان کا یہی تعمیری مزاج ہے۔

لاس اینجلیز سے ٹوکیو تک تقریباً دس گھنٹہ کی مسلسل پرواز ہے۔ یہ پورا سفر بحر الکاہل کے اوپر طے ہوتا ہے۔ بحر الکاہل کی گہرائی اتنی زیادہ ہے کہ اگر اس کے اندر ہمالیہ پہاڑ ڈال دیا جائے تو وہ اس طرح ڈوب جائے کہ اس کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے گا۔ اتنے گہرے اور اتنے بڑے سمندر کے اوپر انسان تیز رفتاری کے ساتھ اڑتا ہوا ایک ساحل سے دوسرے ساحل پر پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا یہ کیسا عجیب کرشمہ ہے۔

"اس وقت ہم ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہے ہیں"۔ جہاز کے پائلٹ نے اعلان کیا۔ میں نے جہاز کے ایک جاپانی افسر سے پوچھا کہ اتنی زیادہ بلندی پر اڑنے کا سبب کیا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس وقت آپ سمندر کے اوپر ہیں، آپ دو ہزار فٹ کی بلندی پر بھی اڑ

سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ نیچے ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ایندھن کو جلانے کے لئے پٹرول کی زیادہ مقدار خرچ ہوتی ہے۔ جب کہ اوپر ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے پٹرول کا خرچ تقریباً نصف کے بقدر گھٹ جاتا ہے۔

جہاز کا بلندی پر جانا جہاز کے لئے مفید ہے مگر وہ انسان کے لئے سخت مضر ہے۔ انسان کے اندر خون کا جو دوران ہے، اس کو متوازن رکھنے کے لئے ہوا کا مناسب دباؤ انتہائی ضروری ہے۔ یہ دباؤ زمین کی سطح پر بالکل مناسب مقدار میں موجود رہتا ہے۔ مگر اوپری فضا میں ہوا کا دباؤ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کم دباؤ کی اس ہوا میں اگر انسان کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو جسم میں خون کا رکنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں خون کان، ناک، آنکھ سے بہنے لگے گا، حتی کہ وہ جلد کو پھاڑ کر نکل پڑے گا۔ اور پھر تھوڑی دیر میں انسان کی موت واقع ہو جائے گی۔

اس مسئلہ کے حل کے لئے ہوائی جہاز میں وہ انتظام کیا گیا ہے جس کو کیبن کا دباؤ (cabin pressurization) کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ۱۹۴۰ سے ہوائی جہازوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ہوائی جہاز زیادہ بلندی پر نہیں اڑ سکتے تھے۔ آج ہم ہوائی جہاز کے اندر اسی طرح بیٹھتے ہیں جس طرح زمین کی سطح پر کوئی شخص کار کے اندر بیٹھتا ہے۔ مگر یہ آسانی اس خصوصی انتظام کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے جس کا اہتمام جدید جہازوں کے اندر موجود ہوتا ہے۔

یہی موجودہ دنیا کا عام قانون ہے۔ یہاں کوئی مسئلہ دوسرے مسئلہ سے الگ نہیں یہاں ایک مسئلہ کے ساتھ دوسرے بہت سے مسائل وابستہ ہوتے ہیں۔ جو شخص کسی مسئلہ کو اس طرح چھیڑے کہ اس نے دوسرے مسائل کی رعایت نہ کی ہو وہ بدترین مجرم ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی حد پر نہیں رکا، اپنی نااہلی کے باوجود وہ اپنی حد سے باہر نکل گیا۔

ٹوکیو میں مجھے ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر دو دن ٹھہرنا تھا۔ ایسے مسافروں کا انتظام ایئر کمپنی کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ ٹوکیو ایئرپورٹ پر اترکر میں نے ہوٹل کے رجسٹریشن کارڈ کی بابت دریافت کیا۔ جواب ملا کہ آپ فلاں جگہ چلے جائیے، وہاں بورڈ پر آپ کا کارڈ لگا ہوا ہوگا۔ متعلقہ جگہ پر پہنچا تو وہاں ٹائپ کیا ہوا رجسٹریشن کارڈ پیشگی طور پر موجود تھا۔ اس طرح کی باقاعدگی

میں نے اب تک کسی اور ایئر پورٹ پر نہیں دیکھی۔

ایئر پورٹ سے ہر آدھ گھنٹہ پر بسیں ہوٹل اور شہر جاتی ہیں۔ میں میجر اومولک سنگھ کے ساتھ باہر نکلا تو ایک بس کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا ہوا تھا ہوٹل نریتا ٹوکیو (Narita Tokyo) ہم اس پر بیٹھ گئے۔ بس چلتی ہوئی ایک ہوٹل پر رکی۔ اندر داخل ہو کر اپنا کارڈ دکھایا تو ہمیں بتایا گیا کہ آپ کا رجسٹریشن ہوٹل نکو نریتا (Nikko Narita) میں ہے۔ اب دوسری بس سے دوبارہ ایئر پورٹ واپس آنا پڑا۔ ایئر پورٹ سے ایک اور بس ملی۔ اس نے ہمیں ہمارے ہوٹل میں پہنچایا۔

یہ غلطی ہوٹل کے نام میں مشابہت کی وجہ سے پیش آئی۔ اسی طرح زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محض لفظی مشابہت کی وجہ سے ایک بے حقیقت چیز کو حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ پوری تحقیق کر کے چیزوں کو اختیار کرے۔ یا کم از کم اس کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے تو وہ فوراً صحیح چیز کی طرف پلٹ آئے۔

نکو ہوٹل میں میرا قیام کمرہ نمبر ۵۴۲ میں تھا۔ ٹوکیو ایک بے حد مشینی شہر ہے۔ یہاں کی پوری زندگی ایک بہت بڑی مشین نظر آتی ہے۔ میرے پاس ایک مہینہ کا ویزا تھا۔ یہاں کا اسلامک سنٹر مجھے مزید ٹھہرانا چاہتا تھا اور ٹوکیو میں میرا پروگرام رکھنا چاہتا تھا۔ مگر ٹوکیو کی مشینی زندگی سے مجھے بہت جلد وحشت ہو گئی۔ میں یہاں زیادہ ٹھہرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔

"اسلامک سنٹر جاپان" ٹوکیو میں واقع ہے (Tel. 03-460-6169) وہ ۱۹۶۵ میں قائم ہوا۔ اس کی باقاعدہ عمارت ۱۹۸۲ میں تعمیر ہوئی۔ اس نے جاپانی زبان میں ۲۵ کتابیں چھاپی ہیں۔ اس کا ایک سہ ماہی جرنل بھی جاپانی زبان میں نکلتا ہے جس کا نام السلام ہے۔ اس کا سرکولیشن تین ہزار ہے۔ اس کے تحت بچوں کا اسکول قائم ہے۔ سیمینار وغیرہ منعقد کئے جاتے ہیں۔ وہ نکاح اور دوسری دینی ضرورتیں پورا کرنے کا مرکز بھی ہے۔ وغیرہ

جاپان میں کسی بھی قسم کا مذہبی امتیاز نہیں ہے۔ چنانچہ برابر کچھ نہ کچھ افراد اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ مگر دوسرے ملکوں کی طرح، یہ سب [illegible] ہو رہا ہے۔ سنٹر کے تعارف نامہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس میں ہم [illegible] اسلام میں خود کشش ہے اور وہ

خود اپنی طاقت سے پھیلتا ہے:

We do not claim any credit. Islam itself has the attracting power.

۱۹۰۹ میں پہلے جاپانی مسلمان نے حج کیا تھا۔ پہلی مسجد کوبے میں ۱۹۳۵ میں بنائی گئی۔ ۱۹۵۲ میں پہلی جاپانی مسلم تنظیم بنی جس کا نام جاپان مسلم ایسوسی ایشن تھا۔ جاپان کی ۱۲۰ ملین آبادی میں مسلمانوں کی تعداد صرف ہزاروں میں ہے۔ تاہم مستقبل میں اسلام کی ترقی کی کافی امید نظر آتی ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں نئے عہد نامہ (New Testament) کا ایک عمدہ نسخہ موجود تھا۔ یہ دو کالم انداز میں چھپا تھا۔ بائیں کالم میں انگریزی انجیل اور دائیں کالم میں اس کا جاپانی ترجمہ چھپا ہوا تھا۔ یہ "جاپان بائبل سوسائٹی" کی طرف سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے شروع میں یوحنا (۳ : ۱۶) کی ایک آیت کے کئی ترجمے دیے گئے تھے اور لکھا ہوا تھا کہ یہ آیت ۱۴۰۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہے۔ وہ آیت عربی کے ترجمہ کے مطابق یہ تھی: لانه هٰكذا احب الله العالم حتى بذل ابنه الوحيد لكى لا يهلك كل من يؤمن به بل تكون له الحياة الابدية۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کتنا المناک واقعہ ہے کہ ہلاکت سے بچنے کا جھوٹا نسخہ ساری دنیا میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ مگر ہلاکت سے بچنے کا جو سچا نسخہ ہے اس کو اہل عالم تک پہنچانے کی تڑپ کسی کے اندر نہیں۔

ہوٹل میں ایک نہایت نفیس قسم کی رنگین چھپی ہوئی کتاب تھی۔ اس کا نام تھا جاپان آج (Japan Now) اس میں جاپانی زندگی کے مختلف مناظر بے حد عمدہ چھپائی کے ساتھ موجود تھے۔ ہر چیز نہایت پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ یہ "جاپانی جنت" کا تعارف تھا۔ مگر جب میں ٹوکیو کی سڑکوں پر نکلا تو یہ جاپانی جنت کہیں موجود نہ تھی۔ بے شمار مسائل نے عملاً اس جنت کو بے معنی بنا رکھا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی یہ زمین بے حد حسین ہے۔ اس میں وہ تمام امکانات رکھ دیے گئے ہیں جن کے ذریعہ یہاں ایک خوبصورت دنیا بنائی جا سکے۔ مگر جدید سائنس

طریقوں کو استعمال کر کے جب آدمی نے یہ خوبصورت دنیا بنالی تو معلوم ہوا کہ اس خوبصورت دنیا میں داخلہ اس کے لئے حرام ہے۔ لوگوں کے پاس خوبصورت مکانات ہیں۔ مگر ان مکانات کے اندر خوبصورت زندگی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا صرف جنت کا تعارف ہے، مگر وہ بذات خود جنت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر ہر قسم کے سامانوں کی موجودگی کے باوجود یہاں آدمی خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

جاپان نسبتاً ایک چھوٹا ملک ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے ہندستان اس سے نو گنا زیادہ بڑا ہے۔ مگر ہندستان آج مقروض ملک ہے، جب کہ جاپان ساری دنیا کو قرض دے رہا ہے۔ اس کی وجہ جاپان کی صنعتی ترقی ہے۔ عالمی تجارت (global trade) میں جاپان کا حصہ تقریباً ۲۵ فی صد ہے۔ جب کہ ہندستان کا حصہ عالمی تجارت میں ایک فیصد سے بھی کم (0.4 Per cent) ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد جیسی جماعتیں بھارتیتا کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ ملک کو سائنس اور صنعت کے میدان میں اوپر اٹھائیں۔ مگر وہ مذہبی جھگڑے بڑھانے ہی کو سب سے بڑا کارنامہ سمجھے ہوئے ہیں۔

ٹوکیو ابتداءً سولھویں صدی میں آباد کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ محض مچھلی پکڑنے کا گاؤں (Fishing village) تھا۔ اور اس کا نام (Yedo) تھا۔ ۱۸۶۸ میں اس کو ٹوکیو کے نام سے موسوم کیا گیا جس کا مطلب مشرقی راجدھانی ہے۔ ۱۹۳۰ میں اس کی آبادی ۵۰ لاکھ کے قریب تھی۔

ٹوکیو بار بار زلزلے سے دوچار ہوا ہے۔ ان میں ۱۹۲۳ کا زلزلہ سب سے زیادہ شدید تھا جس میں شہر کا بیشتر حصہ تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد ٹوکیو کی نئی تعمیر کا سوال سامنے آیا۔ اب ماہرین تعمیرات نے نئے انداز میں شہر کی منصوبہ بندی کی تاکہ زلزلہ کی صورت میں اس کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ مثلاً چوڑی سڑکیں، بڑے بڑے پارک اور اسی طرح مکانات کو لوہے اور سمنٹ کے ذریعہ اس طرح بنانا تاکہ وہ زلزلہ کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں:

New buildings, designed to withstand earthquakes had frames of concrete and steel.

اس طرح جاپان کے اندرونی حالات نے اس کو یہ سبق دیا کہ اگر اس کو زندہ رہنا ہے تو اس کو حالات کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ تباہ ہو جائے گا۔

دوسری عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں فضائی بمباریوں کے نتیجہ میں پھر شہر ٹوکیو کا بیشتر حصہ تباہ ہو گیا۔ اب دوبارہ ٹوکیو کی تعمیر نئے منصوبہ کے تحت کی گئی۔ جاپان نے اپنے ناموافق حالات کے خلاف فریاد اور احتجاج کا انداز اختیار نہیں کیا۔ بلکہ غور و فکر کے ذریعہ اپنی تعمیر نو کی تدبیر تلاش کی۔ یہ جاپانی کردار کا مخصوص پہلو ہے۔ اور اسی نے جاپان کی ترقی میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ ایک جاپانی مثل جاپانیوں کے مزاج کو بہت خوبی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح کیا گیا ہے کہ آدمی فتح سے بہت کم سیکھتا ہے مگر شکست سے وہ بہت زیادہ سیکھ لیتا ہے:

Man learns little from victory, but much from defeat.

اس سفر میں میرا جانا اور آنا دونوں جاپان کے راستہ سے ہوا۔ اس دوران مختلف مراحل پر جن لوگوں سے گفتگو ہوئی ان کو تاریخ وار درج کرنے کے بجائے یکجائی طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ایک سیاح سے ملاقات ہوئی۔ وہ پہلی بار جاپان کی سیاحت کے لئے آئے تھے اور اب واپس وطن جا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جاپان کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک ٹیکسی سے سفر کر رہے ہوں اور ٹیکسی ڈرائیور آپ کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ نہ پا رہا ہو تو وہ ٹیکسی سے اتر کر پبلک بوتھ پر جائے گا اور اپنے پیسہ سے ٹیلیفون کر کے صحیح جگہ کو معلوم کرے گا اور آپ کو عین دروازہ پر لے جا کر اتارے گا ایسا صرف جاپان میں ہوتا ہے:

A cab-driver failing to locate the address you want to reach, rings up from a public booth on his own account to get the exact location and drops you at the very doorstep. This happens only in Japan.

اس قسم کے واقعات کا تعلق قومی مزاج سے ہے۔ قوم کی تعمیر کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت مزاج سازی کی ہے۔ ہمارے یہاں کام کے نام پر بے شمار ہنگامے

جاری ہیں، مگر اسی بنیادی کام کا کوئی وجود نہیں۔

جاپان کی اقتصادی ترقی کو باہر کی دنیا میں رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر خود جاپان کا باشعور طبقہ اس پر زیادہ خوش نہیں۔ میں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جاپانی سے جاپان کی تجارتی ترقی کی تعریف کی۔ اس نے فوراً کہا، مگر جاپان بین اقوامی سطح پر وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا:

But Japan did not succeed to secure the important place it deserves in the comity of nations.

اس کے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ جاپان کے پاس خارجہ پالیسی کا فقدان (lack of foreign policy) ہے۔ میں نے کہا کہ کامیاب خارجہ پالیسی کے لئے کوئی بنیاد درکار ہوتی ہے، اور وہ بنیاد جاپان کے پاس موجود نہیں۔ جاپان نے اپنی پچاس سالہ کوشش سے غیر معمولی اقتصادی ترقی حاصل کر لی۔ اب مسئلہ انٹرنیشنل رول ادا کرنے کا تھا۔ مگر یہاں جاپان اپنے آپ کو غیر مستعد پا رہا ہے:

But Japan finds itself unprepared for it.

اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کسی قوم کو زیادہ سے زیادہ جو چیز دے سکتی ہے وہ بینک بیلنس ہے۔ لیکن محض اقتصادی ترقی کے ذریعہ کوئی قوم عالمی رول ادا کرنے کے قابل نہیں بنتی۔ اس کے لئے مزید کوئی طاقت درکار ہے۔ میں نے کہا کہ جاپان کی حیثیت آج اقتصادی سپر پاور (economic superpower) کی ہے۔ اور امریکہ کی حیثیت عسکری سپر پاور (military superpower) کی۔ امریکہ کی فوجی طاقت نے اس کو عالمی حیثیت دے دی ہے۔ جاپان کے لئے اس کا موقع نہیں کہ وہ فوجی میدان میں امریکہ کا حریف بن سکے۔ تاہم ایک زیادہ اہم میدان ابھی خالی ہے۔ اور وہ نظریاتی سپر پاور (ideological superpower) بننے کا میدان ہے۔ اس میدان میں عمل کر کے جاپان اپنے آپ کو عالمی لیڈر بنا سکتا ہے۔

مذکورہ جاپانی کے لئے یہ بات نئی تھی۔ اس نے پوچھا کہ جاپان کس طرح نظریاتی سپر پاور بن سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے مختصر طور پر اسلام کی اہمیت بتائی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۷۹

۱ رانچی کی ایک مسلم تنظیم کی دعوت پر دسمبر ۱۹۹۱ میں صدر اسلامی مرکز نے رانچی کا سفر کیا۔ وہاں ان کے مختلف پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲ پٹنہ میں باقاعدہ طور پر حلقۂ الرسالہ کا ماہانہ اجتماع شروع ہو گیا ہے۔ یہ اجتماع ہر مہینہ کے دوسرے سنیچر (سکنڈ سٹرڈے) کو ہوا کرے گا۔ مقام اجتماع کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر یہ ہے:

Prof. S. Shahabuddin Desnavi, Taj Manzil,
Chajju Bagh, Patna 800004 (Tel. 224252)

۳ جنوری ۱۹۹۲ میں صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد اور محبوب نگر کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں دونوں مقامات پر مختلف پروگرام منعقد کئے گئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۴ شرق اوسط کے بعض عربی اخبارات نے الرسالہ کے مضامین کا عربی میں ترجمہ ریگولر طور پر چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض عربی پرچے خاتون اسلام کے عربی ترجمہ کے ابواب سلسلہ وار شائع کر رہے ہیں۔

۵ محمد عبد الجبار بنارسی نے بتایا کہ بھینسا (ضلع عادل آباد) میں انھوں نے قارئین الرسالہ کا حلقہ بنایا ہے اور اس کے لئے ایک کمرہ خاص کر کے اس میں اسلامی دار المطالعہ قائم کیا ہے۔ اس طرح بہت سے لوگ دوسرے مقامات پر اسی انداز میں کام کر رہے ہیں۔

۶ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے الرسالہ مشن کو تہ دل سے قبول کیا ہے اور ۸۰ ممبران پر اس کی ایجنسی چلا رہا ہوں۔ مزید ممبر بڑھانے میں مشغول ہوں۔ میں ہر ایک کے گھر جا کر الرسالہ پہنچاتا ہوں۔ گھر گھر جانے میں مجھے ذرا بھی عار محسوس نہیں ہوتا۔ اس کو میں خود تعمیری کے لئے اور دعوتی مشن کا تقاضا سمجھ کر کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ میں الرسالہ کو سبق کی کتاب کی طرح ہر گھر میں پہنچا دوں گا۔ (محمد سلیمان خاں، کھام گاؤں)

۷ مس مہناز سید (۱۴ سال) مس فرح سید (۱۵ سال) دونوں بہنیں ہیں عرب امارات میں

رہتی ہیں۔ وہاں وہ شارجہ انڈین اسکول میں پڑھتی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری ایک ٹیچر مسز رینو کا ہیں۔ وہ اکثر اسلام اور مسلمانوں پر تنقید کرتی رہتی تھیں۔ مہناز سید نے ان کو انگریزی الرسالہ کچھ شمارے پڑھنے کے لئے دئے۔ ان کا ذہن بدل گیا اور اب وہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کرتی ہیں۔ اسی طرح دوسری ٹیچر مسز بچا سنگھ بھی اسلام پر تنقید کرتی تھیں۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ پڑھایا۔ ان کا ذہن بھی بدل گیا۔

۸ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں آپ کے متعلق رسالوں میں بہت کچھ غلط صحیح پڑھتا تھا اور اس کی وجہ سے مجھے آپ سے سخت بیزاری تھی۔ لیکن خدا کا یہ ہمیشہ دستور رہا ہے کہ حق بات ظاہر کر دیتا ہے۔ اتفاقاً میں نے آپ کا الرسالہ پڑھا۔ کچھ ہی پڑھا تھا کہ میرا ذہن بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ لوگ کتنا زیادہ غلط لکھتے ہیں۔ الرسالہ پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ اب مجھے اس کے علاوہ کوئی اور رسالہ یا پرچہ پڑھنے کا دل ہی نہیں کرتا ہے (محمد ابوبکر۔ لکھنؤ)

۹ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ اپنے گوں ناگوں اوصاف کی وجہ سے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ میرا ذاتی تاثر ہے کہ الرسالہ سے ہر شخص اپنے ذوق اور فکر کے مطابق غذا حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم آخرت کا تصور اور دعوت الی اللہ کا پہلو اس میں نمایاں رہتا ہے (عبد الصمد امینی، ہزاری باغ)

۱۰ ایک صاحب لکھتے ہیں: کافی عرصہ سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں اور بڑی حد تک اس سے متفق ہوں۔ ایک ایسا دور بھی تھا جب میں عام نوجوانوں کی طرح جوش کے تحت ملی مسائل کے بارہ میں سوچا کرتا تھا۔ لیکن جب سے الرسالہ ہاتھ لگا ہے میں جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینے لگا ہوں (حبیب احمد ایم اے، نرمل)

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں: ۴۴ سال کی عمر میں بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ مگر جب سے الرسالہ ہاتھ آیا یوں لگا کہ گزرے ہوئے وقت میں جو کتابیں پڑھی تھیں، کوئی عبرت آموز نہ بن سکی۔ سوائے الرسالہ کے کسی کتاب کو پڑھ کر محسوس نہیں ہوا کہ اس کتاب کو ابھی ختم نہیں ہونا چاہئے تھا (شکیل عبد الرحمٰن، مسقط)

۱۲ ایک نئی کتاب تیار ہو رہی ہے۔ وہ ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہوگی اور اس کا نام "عظمت

اسلام" ہوگا۔ اس کے پانچ ابواب حسب ذیل ہوں گے ـــــ عظمت رب، عظمت رسول، عظمت قرآن، عظمت اسلام، عظمت صحابہ۔ اس کتاب کا ہر باب انشاء اللہ پہلے الرسالہ میں خصوصی نمبر کے طور پر چھپے گا اور اس کے بعد اس کو مجموعہ کی صورت میں عظمت اسلام کے نام سے شائع کیا جائے گا۔

۱۳ ایک صاحب لکھتے ہیں: کافی دنوں سے الرسالہ نہیں پڑھا ہے میں نے۔ کچھ پرانے رسالے آج ہاتھ میں آ گئے۔ ان کو پڑھ کر تڑپ گیا ہوں۔ بس یہی دل میں آتا ہے کہ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ سب کچھ مولانا لکھ تو رہے ہیں۔ اس سے زیادہ بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ الرسالہ کا سرکولیشن بہت زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ الرسالہ پڑھتے ہیں وہ پہلے کی بہ نسبت کافی سدھرے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ادارہ مسلمانوں کی کایا پلٹ کر سکتا ہے۔
(شاکر وارث، مراد آباد)

عظمتِ اسلام نمبر

الرسالہ مئی ۱۹۹۲ کا شمارہ بطور خصوصی نمبر شائع ہوگا۔ اس کا عنوان "عظمتِ اسلام" ہوگا۔ اصحاب ایجنسی اپنی مزید مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

ضروری اعلان

الرسالہ اور اسلامی مرکز کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ادارہ کو کچھ افراد درکار ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں سفر کر کے الرسالہ کو متعارف کرائیں۔ اس سلسلے میں ضروری اخراجات کے علاوہ معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ خواہش مند حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں:

AL-RISALA
C-29 Nizamuddin West
New Delhi 110013 Tel. 611128

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد سلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو ہام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں لکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے توقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے و کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۱۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۳۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃 〃	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے ہنس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

دو

یرالقرآن جلد اول	175/-
یرالقرآن جلد دوم	175/-
کبر	45/-
انقلاب	40/-
ہب اور جدید چیلنج	
ظمت قرآن	30/-
ظمت اسلام	6/-
ظمت صحابہ	6/-
ین کامل	50/-
اسلام	40/-
بورا اسلام	40/-
سلامی زندگی	25/-
حیار اسلام	20/-
ازحیات	60/-
مراط مستقیم	40/-
ن اسلام	45/-
وشلزم اور اسلام	40/-
سلام اور عصر حاضر	30/-
ربانیہ	40/-
اروان ملت	45/-
تقیقت حج	30/-
سلامی تعلیمات	25/-
سلام دور جدید کا خالق	25/-
دیث رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	80/-
ڈائری جلد دوم	80/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	80/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	80/-
ات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیات اسلام	6/-
تعدد ازدواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	
صداقت اسلام	
علماء اور دور جدید	
ہندستانی مسلمان	
سیرت رسولؐ	
عربی	
الاسلام یتحدی	
سقوط المارکسیة	
حقیقة الحج	

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقت ایمان	25/-
A-2	حقیقت نماز	25/-
A-3	حقیقت روزہ	25/-
A-4	حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقت حج	25/-
A-6	سنت رسولؐ	25/-
A-7	میدان عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحاد ملت	25/-
A-12	تعمیر ملت	25/-
A-13	نصیحت لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب
V-2	اسلام دائی امن
V-3	اسلام دور جدید کا خالق
V-4	امت مسلمہ کے لیے نئے چیلنج
V-5	اسلام اور سماجی انصاف
V-6	اسلام اور دور حاضر

God Arises	75/-
Muhammad The Prophet of Revolution	75/-
Islam As It Is	
God Oriented Life	
Words of the Prophet	40/-
Introducing Islam	
Religion and Science	
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	20/-
Islam the Creator of Modern Age	50/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	6/-
Polygamy in Islam	3/-
Words of Wisdom	

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

1976-77 سال	90/-
1978	80/-
1979	80/-
1980	80/-
1981	80/-
1982	80/-
1983	80/-
1984	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91	85/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

THE ISLAMIC CENTRE C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013
Single Copy Rs 5 □ Annual Subscription Rs 60/$25